46350

زیر و بم

کتب بینی

سب سے

بڑی عبادت

ہے اور ماحول

سب سے

بڑا معلّم

زیر و بم

فارغ بخاری

گوشۂ ادب ۔ لاہور

پرنٹرز:- ملک مبارک علی، انشا پریس، لاہور۔

پبلشرز:- م، ع، سلام۔ گوشۂ ادب، لاہور۔

قیمت:- تین روپے   جنوری ۱۹۵۲ء   بار اول

رضا ہمدانی

کے نام ——!

فہرس

دیباچہ ۹

آزادی سے پہلے ۴۵ تا ۴۷ء

ابتدائیہ ۱۹

غزل ۱۶

غزل ۱۷

صدمہ ۲۲

شکایت ۲۳

دوراہا ۲۵

غزل ۲۷

بھکارن ۲۸

غزل ۳۰

مشورہ ۳۱

نغمۂ حیات ۳۳

زہرخند ۳۷

تاج محل ۳۹

غزل ۴۰

احساس ۴۱

انحراف ۴۳

غزل ۴۴

غزل ۴۵

فیصلہ ۴۶

وقت کا راگ ۴۷

فخر کر ہندوستاں ۴۹

آزادی کے بعد ۴۷ تا ۵۱ء

۱۵ اگست ۴۷ء ۵۳

پکار ۵۴

غزل ۵۶

آزادی سے پہلے، آزادی کے بعد ۵۷

تشنگی ۵۹

غزل ۶۱

تعمیر ۶۲

غزل ۶۴

غزل	۶۵	سخن گسترانہ	۹۷
بغاوت	۶۶	قیدی	۹۹
یاد دہانی	۶۸	بڑھے چلو ——!	۱۰۱
غزل	۷۱	یقین و عمل	۱۰۲
تقاضا	۷۲	غزل	۱۰۳
ثواب	۷۴	قدیم و جدید	۱۰۴
خیبر	۷۶	دولتِ مشترکہ	۱۰۵
مغویہ	۷۸	اجالا	۱۰۶
غزل	۸۰	سحر سے پہلے	۱۰۸
نومولود	۸۱	خوشحال خاں خٹک	۱۱۰
فردِ جرم	۸۳	یادگاریں	۱۱۲
بازگشت	۸۴	غزل	۱۱۴
آزادی کا دوسرا سال	۸۶	غزل	۱۱۵
غزل	۸۸	غزل	۱۱۶
کھوٹے سکّے	۸۹	ارتقا	۱۱۷
فن کار کہاں جائیں	۹۱	رحمان بابا	۱۱۹
تجربہ	۹۳	یوم مئی	۱۲۲
احتجاج	۹۵	ناظم حکمت	۱۲۳
		غزل	۱۲۴
		قطعات	۱۲۵



دیباچہ

فارغ بخاری کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی نظمیں آپ آئے دن رسالوں میں پڑھتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی شاعری کی عمر ابھی مختصر ہے۔ اس کی ابتدا ۱۹۴۵ء سے ہوتی ہے۔ اس مختصر سے وقت میں جو شہرت اور رتبہ انہوں نے اپنے ہم عمر اور ہم عصر شعرا کے درمیان حاصل کیا ہے۔ وہی ان کا تعارف ہے۔ میری حقیر کوشش تو صرف اتنی ہوگی کہ میں ان کی شاعری کا تجزیہ کرسکوں۔ اس کے واضح خدوخال کو نمایاں کر کے اس کے سمت کو متعین کرسکوں۔

زیرِ نظر مجموعے میں انہوں نے اپنی نظموں کو سن وار دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حصّہ تو آزادی سے پہلے کا ہے اور دوسرا "آزادی" کے بعد کا۔ معلوم نہیں آپ آزادی کے لفظ سے چونکیں گے کہ نہیں لیکن میں تو ضرور چونک اُٹھتا ہوں۔ میں اس کا منکر نہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کو ڈومینین کا مرتبہ ملا۔ لیکن اِس مرتبے کو آزادی

کا زینہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ دراصل غلط فہمیاں انہیں تصورات کے مابین رہی ہیں ڈومینین اسٹیٹس کو مکمل آزادی بنانے والوں میں حکمران طبقہ اور انکے بھی خواہ پیش پیش رہے ہیں! او غالباً انہیں کے پروپگنڈے کا یہ اثر تھا۔ کہ ہمارے قریب قریب تمام ہی ترقی پسند شعراء نے آ گوروں کی جگہ کالوں کی حکومت بتائی۔ اور اس تبدیلی کو بدیسی سامراج سے حاصل کی ہوئی آزادی جانا میں اس خیال کا حامل نہیں ہوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ابھی ہم بدیسی سامراج سے آزاد نہیں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے پہلے غیر منقسم ہندوستان میں بورژوا آزادی کے جذبے کو مراعات حاصل کرنے کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ مکمل طور پر فروخت نہیں ہوا تھا لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد وہ ڈومینین اسٹیٹس کو عوام کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔ اور اب وہ فروخت ہو چکا ہے۔ میں نے اس چیز کا تذکرہ اس لئے کر دیا کہ آزادی کے بعد کی نظموں کا پس منظر اور ہماری اجتماعی غلط فہمی آپ کے پیش نظر رہے۔

فارغ بخاری کی ابتدائی اور بعد کی نظموں میں کوئی ایسی حد فاصل نہیں ہے جس کے باعث آپ انہیں دو خانوں میں تقسیم کر سکیں۔ ایک ہی سر رشتہ سے جو ارتقائی صورت میں زیادہ واضح زیادہ قوی اور زیادہ روشن ہوتا جاتا ہے۔ اُن کی شاعری کی ابتداء ہی نغمۂ حیات سے ہوتی ہے۔ ایک ایسا نغمہ جو فسردہ لے کی تردید بھی کرتا ہے۔ اور منفی رجحانات کی نفی بھی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ شاعر کا یہ جذبہ ایک شعوری کیفیت کا حامل ہے ایک سنجیدہ فکر اور سائنٹفک تجربے کا مدعی ہے۔ اور مجموعی اعتبار سے اپنے زمانے کے غالب شعری رجحان کا ردِ عمل بھی ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ ردِ عمل ۱۹۴۵ء کے ایسے مبہم اور سراسیمہ ماحول میں جنم لیتا ہے جبکہ تھوڑے سے ترقی پسند شعرا کو چھوڑ کر دانش ور طبقے کے زیادہ تر شعراء حزن و یاس اور تشکک کی وبا میں گرفتار تھے

ایک ایسے دور میں جب ایک نوزائیدہ آواز اپنے ماحول کی تاریکی کو چیرنا چاہتی ہے تو اس کی کوشش شعوری انداز نظر کا نتیجہ ہوتی ہے ہے

گنگناؤ نہ فسردہ لئے میں زندگی کے متبسم نغمات

کیا فقط رستے ہوئے زخموں کو کر لیا تم نے ہے عنوانِ حیات

بزمِ ہستی کو مکدّر نہ کرو

کیوں بنے پھرتے ہو ناسورِ حیات

اِس تجزیے کے بعد وہ ایک مثبت پیغام بھی دیتا ہے۔

آؤ میدانِ عمل میں آؤ رنجِ دوراں سے کنارا کر لو

محض گفتار کا یہ وقت نہیں زخمِ کردار گوارا کر لو

لیکن فارغ بخاری کی یہ نظم آزادی کے پہلے کی نظموں پر حاوی نہیں ہے۔ اور نہ ان کے غالب رجحان کا فیصلہ ہی کرتی ہے۔ ہر چند یہ کوشش شعوری سہی لیکن بنیادی رجحان رومانوی طرزِ تخیل سے آزاد نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس کا احساس "انحراف" اور "دو راہے" کی نظموں میں ہوتا ہے۔ اگر انحراف میں ایک طرف رومان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش ہے تو "دوراہے" میں شاعر اپنی اس کوشش پر ہنستک بھی ہے۔

سوچتا ہوں کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں

ان کا یہ اندازِ نظر بعد کی نظموں میں باقی رہتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ تصفیہ میرے لئے ناممکن ہے کہ ان کی ابتدائی انقلابی آواز کسی سائنٹفک مزاج کا نتیجہ ہے میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کی ابتدائی شاعری کا انقلابی بانکپن ماحول کے ردِّ عمل کا نتیجہ ہے۔ اور چونکہ انہیں ردِ عمل میں وراثتاً زیادہ تر رومانوی بغاوت ہی کی روایات ملی تھیں۔ اِس لئے

اِس انقلابی بانکپن کا رشتہ کبھی اختر شیرانی کی رومانیت تو کبھی جوش کی رومانوی انقلابیت سے جا ملتا ہے۔ اِس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے ادب میں صحیح انقلابی ادب کی روایات نہیں رہی ہیں اگرچہ روایات موجود ہیں اور اِس ضمن میں بعض بڑی حسین نظمیں لکھی گئی ہیں لیکن اُن کا سرمایہ اتنا تھوڑا ہے کہ وہ غالب رجحان بنکر نئی پود تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کا سبب صرف سرمایہ کی قلت ہی نہیں بلکہ قدوقامت کی کوتاہی بھی ہے۔ جو حسن سے ایک علیحدہ چیز ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومانوی انقلابیت ہی کی روایات نئی پود تک پہنچی۔ مثال کے طور پر فارغ کی نظم "بھکارن" لیجیے یہاں وہی جوش صاحب والا تصوّر ہے کہ حسن اور اِس عالم میں۔ ان کی ایک دوسری نظم "شکایت" لیجیے۔ یہاں لہجہ اختر شیرانی کا ہے لیکن وہ خود سپردگی اور جذباتی بہاؤ نہیں ہے۔ جو اختر شیرانی کے یہاں ہے۔ اور اِس کا سبب زمانے کا بُعد ہے

اختر شیرانی کی رومانیت کا صرف ایک ہی جز و حسن و شباب سے متاثر ہونے کی کیفیت کا فارغ کے حصے میں آیا ہے لیکن اس کی ہیئت کا شعوری نہج فارغ کے یہاں بدل جاتا ہے۔ اختر شیرانی کا انقلابی شعور آزاد شخصیت، اظہارِ جذبات اور خیالات کی آزادی کا حامل تھا لیکن فارغ کا شعور ایک ایسے سماجی انقلاب کا حامل ہے۔ جو پوری شخصیت کو متوازن کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی کے تمام مادی عیوب کو بھی دور کر سکے ؎

میری آواز دبانے سے نہیں دب سکتی	کیوں بتوں کی طرح ہونٹوں پہ رہے مہرِ سکوت
موت کی دھمکیاں کھانے سے نہیں دب سکتی	صاف کہتا ہوں کہ اب تو یہ مچلتی ہوئی بھوک

اور جب شاعر اِس قطعی فیصلے کے بعد یومیہ زندگی کی طرف گامزن ہوتا ہے تو اسے ایک عجیب و غریب حادثے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ابھی گلشن میں بہار آئی بھی نہ تھی کہ قتل و خون کا بازار گرم ہو جاتا ہے "پندرہ اگست" اور "پکار" انہیں حالات سے متاثر

ہو کر لکھی گئی ہیں۔ لیکن شاعر پر ان حالات کا ردِ عمل صرف تاثر ہی کی صورت میں نمودار نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اسکی قوتِ عمل انقلابی جذبے کے لیئے ایک تازیانہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ جب وہ "انقلاب" میں اپنے پیغام کو پیش کرتا ہے۔ تو قتل و خون کے مظاہر کو سیاسی رشتوں میں پرونا ہے لیکن جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں۔ یہ تجزیہ اجتماعی غلط فہمی کا شکار ہے مثلاً یہ شعر ؎

اجنبی شاہوں کے بت ٹوٹ چکے ہیں لیکن　　　　اونچے ایوانوں کی عظمت کا صنم باقی ہے

لیکن اس فریب کے پیچھے جو حقیقت ہے اس سے شاعر بے خبر نہیں ہے ؎

یہ بہاریں، یہ سمن زار یہ شاداب فضا
کیوں سلگتی ہوئی آنکھوں کے لیئے عام نہیں
آپ کے ذوقِ وفا کا تو یہ انعام نہیں
ساتھ ہم دے نہ سکے اہلِ زمانہ کا مگر
آپ ہر دَور میں ایوان سجا لیتے ہیں
وقت کے بدلے ہوئے ساز پہ گا لیتے ہیں

شاعر کے یہاں تجزیہ جتنا ہی صاف ہوتا جاتا ہے اسے اس امر کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ اس کے ملک و وطن کی آزادی کی جنگ محنت کش انسانوں ہی کی رہبری میں لڑی جا سکتی ہے۔ فارغ بخاری کی بعد کی نظموں میں یہ شعور رفتار رفتہ ابھرتا گیا ہے۔ ان کی آواز میں زیادہ وزن اور ان کے فن میں زیادہ نکھار پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حقیقت پر ان کی گرفت مضبوط ہو گئی ہے۔

نظموں کے علاوہ آپ کو اس مجموعے میں غزلیں بھی ملیں گی۔

غزل کے متعلق جو شاعر کا دعویٰ ہے وہ یہ کہ

نئے انداز سے چھیڑی ہے غزل فارغ نے
اَب ہر اک لب پہ بغاوت کے ترانے ہوں گے

اور یہ صحیح بھی ہے کہ ان کی غزلوں کو آپ صرف اِسی معیار پر جانچ سکتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اِس صنفِ سخن کو انقلابی معنی کے ساتھ جس فن کارانہ اسلوب سے نبھانا تھا۔ اس میں آپ کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اور جہاں تک میں غور کرتا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُنہوں نے غزل میں خطابت سے کام لیا ہے۔ چنانچہ جن غزلوں میں خطابت نہیں ہے وہ بہت زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ کامیاب غزل میں بغاوت کے ترانے نہیں ہیں۔

یہ ہیں ان کی شاعری کے موٹے موٹے خد و خال جنہیں میں اپنی گرفت میں لا سکا ہوں۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ کہ ان کی شاعری کی عمر بہت قلیل ہے۔ آپ پانچ چھ سال کے عرصے میں اس کی توقع نہیں کر سکتے ہیں کہ انہیں فنی محاسن پر اساتذہ کے ایسا عبور حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے ایک عمر درکار ہوتی ہے۔ . . . . ان کے بعض مصرعے ڈھیلے اور بعض لفظوں کا انتخاب احسن نہیں ہے لیکن ان جزوی خامیوں کے باوجود جو چیز آپ کو خاص طور پر متوجہ کرے گی۔ وہ ان کا طربناک اظہار کا جذبہ ہے۔ وہ حقیقت کی مصوّری کرتے ہیں لیکن فسانے کی کیفیّت باقی رکھتے ہیں۔ یہ احساس بذاتِ خود انکے فن کو بلندیوں پر پہنچانے کا ضامن ہے کیونکہ فن کی ابتدا ہی اس طرح ہوئی ہے کہ فسانے کو حقیقت پر عائد کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں حسیّہ اظہار، اور خیالات کو متحرک جذبے میں تبدیل کرنے کی تمام خوبیاں

موجود ہیں۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے خارجی حقائق کی طرف رہنمائی کرتے ہیں یعنی بحر و تصورات سے گزر کر خارجی حقائق کی طرف لوٹتے ہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس شش جہت میں ان کے دل میں اپنی دریافت اور جستجو کا بڑا شدید جذبہ ہے فارغ بخاری فطرتاً شاعر ہیں۔ لیکن پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ ان کا ایک ہاتھ نبض پر ہوتا ہے تو دوسرا مزاج کی جستجو کرتا رہتا ہے۔ اور شاید یہی سبب ہے کہ وہ اکثر ایک آدھ بار فرار طلب نغمہ بھی چھیڑ دیتے ہیں ممکن ہے کہ یہ کوئی (CATHARSIS) کے قسم کی چیز ہو۔ جو آگے چل کر ان کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو

یہ نہ کوئی نصیحت ہے اور نہ مشورہ۔ بلکہ حقیقت ہے کہ انقلابی شاعری کے شایان شان ایک ایسا فن کارانہ اسلوب بھی ہوتا ہے جو پرانے اسلوب سے کہیں زیادہ بلند تر ہوتا ہے۔ اور ہمارے شعراء کو اس معیار کے لئے ہمیشہ جد و جہد کرتے رہنا چاہئے کیونکہ شاعری کا میدان خدمتِ خلق کے ساتھ ہنر مندی کا بازار بھی ہے۔ اس میں نئے پرانے سبھی آتے ہیں۔ لیکن ایک انقلابی کا تیور ہی کچھ مختلف ہوتا ہے۔ وہ تو یہی آواز دیتا ہے۔ ع

از شعلہ تراشش کردہ ام حرف

دیکھنا ہے یہ فخر کون چھینتا ہے۔ مجھے فارغ سے بڑا خطرہ ہے۔

ممتاز حسین

کراچی ۱۵ ارمئی ۱۹۵۲ء

آزادی سے پہلے

سنہ ۱۹۴۵ءتا سنہ ۱۹۴۷ء

ابتدائیہ

کتنے طاقوں کی شمعیں بجھاتے ہوئے
ایک قندیل کو میں نے روشن کیا
اور اس روشنی کا سہارا لیا
ظلمتوں میں، خرابوں میں بڑھتا رہا

○

مدتوں اپنے بھٹکے ہوئے ذہن کی
میں نے تسکین کی محض اوہام سے
تشنگی کو بجھانے میں کوشاں رہا
سالہا سال تک میں تہی جام سے

○

میں ضیا جس کو سمجھا تھا دراصل وہ
تیرگی کے مقدّر کی معراج تھی
ذہن میں جگمگاتی تھی قندیل جو
روشنی کے لئے وہ بھی محتاج تھی

○

اس کشاکش کو بڑھتا ہوا دیکھ کر
آج یہ دیپ بھی میں نے گل کر دیا
سحر تھا یہ اِک ایسا جسے توڑ کر
جزو کو میری پھونکوں نے کُل کر دیا

○

وہ ستارہ حقیقت میں ثابت ہوا
ظلمتوں کی نگاہوں کا پالا ہوا
اسکے جلتے ہی اِک انقلاب آ گیا
چار جانب اُجالا اُجالا ہوا

○

ہر قدم پر اک سنہری جال پھیلایا گیا
آرزوؤں کے سلاسل میں مجھے لایا گیا

میرا افسانہ ہی ہر محفل میں دُہرایا گیا
میرا ہی نغمہ تھا جو ہر ساز پر گایا گیا

ابر پارے جگمگا اُٹھے شرارِ برق سے
یا فضاؤں میں ترے آنچل کو لہرایا گیا

ترکِ الفت پر بھی ان کی یاد ذرّہ باقی رہی
آخری منزل تلک ہمراہ یہ سایا گیا

بھول جا آغازِ الفت کا وہ عہدِ خوشگوار
زندگی کا اِک سنہرا خواب تھا آیا گیا

تیرے فارغؔ کی جوانی ایک نغمہ تھا جسے
زندگانی کے سلگتے ساز پر گایا گیا

بیاں رودادِ غم ہائے نہانی کر نہیں سکتے
میرے آنسو بھی دل کی ترجمانی کر نہیں سکتے

جوانی کا تقاضا ہے جبیں غرق گنہ ہو کر
ابھی ارمان مرگ ناگہانی کر نہیں سکتے

غرورِ بندگی، ذوقِ یقیں، زعمِ وفاداری
ستم ہے دور اُن کی سرگرانی کر نہیں کر سکتے

یہ بہکی بہکی سازِ دل کی تانیں کون روکے گا
غم و اندوہ اخفائے جوانی کر نہیں سکتے

کہا ہے جب سے اُن کو زندگی اپنی، پشیماں ہیں
کہ ترکِ آرزوئے زندگانی کر نہیں سکتے

وہ ہلکی سی ترنم ریز صوت دل نشیں فارغ
ہزاروں نغمے جس کی ترجمانی کر نہیں سکتے

صدمہ

ہونٹوں پہ نہیں اب وہ تبسم کا بسیرا
زلفوں میں وہ راتیں ہیں نہ آنکھوں میں سویرا

گل ہو گئی قندیل شبستانِ نظر کی
چتون کے چراغاں پہ برستا ہے اندھیرا

اُٹھتی نہیں اب حشر خرامی سے قیامت
چھاتا نہیں پلکوں کا وہ اب ابر گھنیرا

جوبن سے ڈھلک کر وہ شرارت سے فضا میں
لہراتا نہیں اب ترے آنچل کا پھریرا

فرقت نے یہ کیا جانِ وفا کر دیا تجھ کو
چھ سال میں نقشِ کفِ پا کر دیا تجھ کو

دل کے لئے لیکن ترا انداز وہی ہے
نغمات ہیں پھیکے سے مگر ساز وہی ہے

تجھ میں وہ ستاروں کی لطافت نہیں لیکن
افسونِ محبت کا تو اعجاز وہی ہے

کیا فکر جو دل کش وہ خد و خال نہیں ہیں
گر حسن نہیں عشق جنوں ساز وہی ہے

جو شمع کی صورت درِ ہستی کو لٹا دے
الفت کی قلمرو میں سرافراز وہی ہے

تا زندگی پوجوں گا مجھے پاسِ وفا ہے
میرے لئے اب بھی ترا اعزاز وہی ہے

یہ حادثہ جانکاہ گناہوں کیلئے ہے
یہ صدمہ ہوسناک نگاہوں کیلئے ہے

شکایت

اے ملائک کے حسیں پیار ٹھہر
اے پرستش کی سزاوار ٹھہر

یہ حجاب رخِ پُر نور اٹھا
تیری پلکوں کا گھنیرا سایا
پردہ پوشی کو بھلا کم تو نہیں
زلف مشکیں کی ردا کم تو نہیں

تیری عصمت کا محافظ ہے نقاب؟
اس سے قائم ہے ترا حسن و شباب؟

میری طینت سے برستے ہیں گناہ
کیا کہا؟ میری ہوس کا رنگاہ
زخمی کرتی ہے ترے چہرے کو
یہ کہیں ہرزہ سا معیار نہ ہو

سوءِ ظن اپنا ہمہ گیر نہ کر
میرے جذبات کی تحقیر نہ کر

معصیت عام سہی ماہ جبیں
سارے انسان تو رندے تو نہیں
کفر و الحاد کی تلقین ہے یہ
میرے احساس کی توہین ہے یہ

ہر طرح تو بھی تو معصوم نہیں
تیری ٹھوکر کا یہ مفہوم نہیں

ساری دنیا کو کہے ناہموار
باغ میں پھول بھی ہیں شاخ بھی خار

تیری نظروں کا بھی ہے اس میں قصور
ہو نہ کم مایہ کہیں تیرا شعور

اے پرستش کی سزاوار ٹھہر
اے ملائک کے حسیں پیار ٹھہر

○

دوراہہ

یہ تیری اُٹھتی جوانی ہے کہ رُوح مہتاب
مست کوئل کی صدا ہے کہ تیرا سازِ شباب
تیری پلکوں میں ہیں سوئے ہوئے فردوس کے خواب
تیری مستانہ نگاہوں سے برستی ہے شراب

اس سے میں رُوح کو سرشار کروں یا نہ کروں
سوچتا ہوں کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں

پیار تیرا میرے احساس کو گرماتا ہے
تیرا ہر نغمہ میری رُوح سے ٹکراتا ہے
دل تیری سادگیٔ حسن سے شرماتا ہے
تیری دوشیزہ تمناؤں پہ رحم آتا ہے

خلش رُوح کا اظہار کروں یا نہ کروں
سوچتا ہوں کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں

میری آغوشِ محبت کی طلبگار ہے تُو
زندگی مجھ پہ لٹا دینے کو تیار ہے تُو
کتنی معصوم ہے تُو کتنی وفادار ہے تُو
حق تو یہ ہے کہ پرستش کی سزاوار ہے تُو

تیری الفت کا میں اقرار کروں یا نہ کہ دل
سوچتا ہوں کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں

تیری معصوم نگاہیں مجھے کیا سمجھی ہیں
شعلۂ آز کو یہ شمع وفا سمجھی ہیں

ہوس آمیز نظر جوئے بقا سمجھی ہیں
اہرمن کو رہِ الفت میں خدا سمجھی ہیں

تجھے اس خواب سے بیدار کروں یا نہ کروں
سوچتا ہوں کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں

جب تلک تجھ میں قیامت کی ادا باقی ہے
تیری آنکھوں میں ستاروں کی ضیا باقی ہے

تیرے چہرے پہ جوانی کی ردا باقی ہے
میرے جذبات میں احساسِ وفا باقی ہے

اپنی فطرت سے خبردار کروں یا نہ کروں
سوچتا ہوں کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں

قیمتِ عصمتِ دل مجھ سے ادا کیا ہوگی
شیشہ پتھر پہ گرے گا تو صدا کیا ہوگی

معصیت کیش نگاہوں میں حیا کیا ہوگی
مردہ ہوں مردہ سے امیدِ وفا کیا ہوگی

جذبۂ دل کو گنہگار کروں یا نہ کروں
سوچتا ہوں کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں

آرزوؤں کے ترانے گا نہیں سکتا ہوں میں
اِن کھلونوں سے بھی جی بہلا نہیں سکتا ہوں میں

اللہ اللہ مبتلائے عشق کی مجبوریاں
ترکِ الفت کی قسم بھی کھا نہیں سکتا ہوں میں

کس قدر کیف آفریں ہے وہ نگاہِ دل نشیں
خود سمجھتا ہوں مگر سمجھا نہیں سکتا ہوں میں

وہ محبت کی جوانی وہ ستاروں کا شباب
کتنے افسانے ہیں جو دہرا نہیں سکتا ہوں میں

ہر گھڑی تیرا نشہ، تیرا تصوّر، تیری یاد
وہ حقائق ہیں جنہیں جھٹلا نہیں سکتا ہوں میں

بھکارن

شب کی مرگ آفریں خموشی میں
گاؤں کی پُر سکون وادی میں

اک حسینہ شباب کا پیکر — ایک دوشیزہ ماہ کی ہمسر
نوجواں، خوبرو، حسیں دیوی — بھولی بھالی سی نازنیں دیوی
دستِ فطرت کا شاہکار حسیں — حسن کے آسمان کی پروِیں
اشک ڈھلکے ہوئے ہیں گالوں پر — مٹیاں جم رہی ہیں بالوں پر
بال بکھرے ہوئے ہیں شانوں پر — دھجیاں اڑ رہی ہیں رانوں پر
گرد چہرے پہ، ماتھے پر شکنیں — جھک رہی ہیں حجاب سے نظریں
مضطرب دل، نگاہ آوارہ — یاس و نومیدیوں کا گہوارہ
چلنے میں لڑکھڑا رہے ہیں قدم — بڑھ کے پھر پیچھے آ رہے ہیں قدم

یوں بنی ہیئت گدائی ہے
ہاتھ میں کاسۂ گدائی ہے

بھوک کے ہاتھوں ہو رہی ہے نڈھال
ایک زحمت ہے، یہ شباب و جمال

کٹ رہا ہے شباب خواری میں
دن تڑپنے میں رات زاری میں

کیوں نہ یہ بد نصیب کرلائے
صبح سے شام ہو گئی ہائے

شہر کا چپہ چپہ ماپا ہے
کوچے گلیوں کو چھان ڈالا ہے

سوکھی روٹی بھی آہ مل نہ سکی
آج بھی یونہی بھوکی سوئے گی

پیٹ بھرنے کو کچھ تو پا جائے
کاش قدرت کو شرم آ جائے

○

دل میں رہے نگاہ سے مستور ہو گئے
جتنے بھی وہ قریب ہوئے دور ہو گئے

یوں آئے مشعلِ رخِ زیبا لئے ہوئے
دیر و حرم کے قمقمے بے نور ہو گئے

منزل کی جستجو رہی ہر گام پر جنہیں
وہ جادۂ وفا سے بہت دور ہو گئے

کچھ دار سے اُلجھ کے بھی ناکام ہی رہے
کچھ حسنِ اتفاق سے منصور ہو گئے

جو بِک گئے ضمیر اُنہیں خواجگی ملی
جن کو خودی عزیز تھی مزدور ہو گئے

اس مستِ نازِ حسن کا جب ذکر چھڑ گیا!
وارفتگی میں جام و سبو چور ہو گئے

مشورہ

اونچے ایواں ہیں میسر نہ زر و سیم مجھے
ملنے والی نہیں اجداد کی تقسیم مجھے
کرنا پڑتا ہے ترے سامنے تسلیم مجھے
مرے قبضے میں نہیں کچھ بھی محبت کے سوا

ظاہری شان مری ملتی ہے سلطانوں سے
رنگ اور کیف برستا ہے مری تانوں سے
میکدے جھانک رہے ہیں مرے پیمانوں سے
مری آنکھوں میں نہیں خاک مروّت کے سوا

تو سمجھتی ہے کہ اِک شاعرِ مشہور ہوں میں
تنگدستی کی نجاست سے بہت دُور ہوں میں
تجھ کو شاید نہ یقین آئے کہ مزدور ہوں میں
پوچھتا ہی نہیں مجھ کو کوئی نکبت کے سوا

یہ جرائد مری نظموں کے لئے جیتے ہیں
شعر میرے دلِ صد چاکِ ادب سیتے ہیں
مکتبے میری تصانیف کا خوں پیتے ہیں
کچھ بھی حاصل نہیں ارزانیٔ شہرت کے سوا

تیری ہیرے سے تراشی ہوئی باہوں کی قسم
لحنِ پازیب سے گونجی ہوئی راہوں کی قسم
سرد راتوں میں جوانی کے گناہوں کی قسم
اب کسی چیز کی وقعت نہیں دولت کے سوا

سوچ پھر سوچ! پشیمانِ وفا ہو نہ کہیں
بعد میں شومیٔ قسمت کا گلہ ہو نہ کہیں
ذہن تیرا ہی ترے دل سے جدا ہو نہ کہیں
حسن کو چین کہاں آئے گا راحت کے سوا

○

نغمۂ حیات

گنگناؤ نہ فسردہ لے میں — زندگی کے متبسم نغمات
کیوں فقط رِستے ہوئے زخموں کو — کر لیا تم نے ہے عنوانِ حیات
کیوں سمجھ بیٹھے ہو نادانی سے — شاخِ آہو پہ مسرت کی برات
ذہن میں نقشِ خراشیں کیوں ہیں — کیوں سمائے ہیں نظر میں صدمات
ناتواں روح ہے پستی کی امیں — مضمحل دل میں ہیں زخمی جذبات
زندگی بخش نہیں ہے کیا یہ — یاسمیں تاروں کا انبوہِ حیات
قہقہوں کے لئے موزوں نہیں — نقرئی چاند کی پُرنور برات
گدگداتے نہیں مردہ دل کو — آسماں کے یہ روپہلے اوقات
کیا گلوں میں نہیں مستی کا سرور — کیا بہاروں میں نہیں کیفِ حیات
طرب افزا نہیں کیا شام و سحر — کیف انگیز نہیں کیا دن رات
خندہ زن ہیں جگر افگاروں پر — بامِ گردوں پہ طلائی آیات

بزمِ ہستی کو مکدر نہ کرو
کیوں بنے پھرتے ہو ناسورِ حیات

جانتا ہوں کہ غلامی کے طفیل   پے بہ پے آئے ہیں سینے پہ خراش
مستقل روگ بنا رہتا ہے   نوجوانی کے لئے فکرِ معاش
نیم عریاں لئے پھرتے ہو   دوش پہ ہند کے افلاس کی لاش
ذکرِ اسلاف پہ ہو گرمِ فغاں   ہے تمہیں گم شدہ خوابوں کی تلاش

سالہا سال سے اے غم زادو
شادمانی سے تمہیں ہے پرخاش

فکر رنجور رسی، ناقص تخئیل   ذہن الجھے ہوئے ماؤف دماغ
قہقہوں سے نہ کبھی لب کھیلے   کبھی حاصل نہ ہوا عیش و فراغ
نقش ہیں اجڑے ہوئے سینے پر   کتنی معصوم تمناؤں کے داغ
تم سمجھتے ہو بہاروں کو علیل   تم کو بیمار نظر آتے ہیں باغ

تم جلاتے ہو جہالت کے دیئے
تم بجھاتے ہو تمدن کے چراغ

کیا ضرورت ہے زمانے کو بھلا   تم سے فالج زدہ انسانوں کی
پیٹ بھرنے کے لئے ہو محتاج   ٹھوکریں کھاتے ہو بیگانوں کی
آرزؤں کی جواں مرگی ہے   بے کفن لاش ہے ارمانوں کی
آج بازارِ جہاں میں دیکھو   کوئی قیمت نہیں نادانوں کی

دیکھو تہذیب و تمدّن کا شباب
اب یہ دنیا نہیں حیوانوں کی

تم وہ درماندہ ہو اُٹھنے کیلئے ڈھونڈھتے پھرتے ہو اغیار کا دوش
درد اُٹھتا ہے تو اک آہ کے ساتھ دل میں کر لیتے ہو فریاد خموش
بجھ چکے ہیں وہ قیادت کے شرر مٹ چکا ہے وہ حکومت کا خروش
اب یہ سر ہی نہیں شایانِ جنوں اب یہ دل ہی نہیں آمادۂ ہوش

اب طبیعت میں نہیں ہے وہ ابال
اب حمیّت میں نہیں فطرتِ جوش

یوں فضائیں متعفّن نہ کرو راہ پر لاؤ ذہنیت نہ مزاج
تم اگر چاہو تو کچھ دُور نہیں نقش تقدیر بدل سکتا ہے آج
زورِ تدبیر سے کر لے سکتے ہو مہر کے پرتو رنگیں سے خراج
توڑ دو درد و الم کے پیکر چھوڑ دو لغو سے یہ رسم و رواج

کر دو پامال یہ سب کہنہ نظام
پھونک دو آگ میں فرسودہ سماج

آؤ میدانِ عمل میں آؤ رنج دوراں سے کنارا کر لو
محض گفتار کا یہ وقت نہیں زخم کردار گوارا کر لو

یہ بھی جینے میں کوئی جینا ہے　　　کچھ تو احساس خدارا کر لو
میری آنکھوں سے تمہری آنکھوں سے　　　اپنی پستی کا نظارا کر لو

قوم کی نبض ہے ڈوبی جاتی
وقت ہے وقت ہے چارا کر لو

مسکراؤ کہ یہی جنت ہے　　　زندگی نام ہے لہرانے کا
گاڑ دو مرتے ہوئے ماضی کو　　　یہ فسانہ نہیں دہرانے کا
خون اپنے سے بناؤ کاجل　　　نگہ حال کو چمکانے کا
قوم کے واسطے تم زینہ ہو　　　بام پر دیں پہ پہنچ جانے کا

تم کو عنوان کہا جاتا ہے
مادرِ ہند کے افسانے کا

زہر خند

شراب سے مجھے کیوں کد ہے غمگسار میرے
اس آگ سے مجھے ہوش و خرد جلانے دے
حقیقتوں کے زرافشاں نقاب کو نہ اُٹھا
مری نظر کو فریبِ حیات کھانے دے

فسانہ سازطبیعت تیری نے یہ سمجھا
کہ میں بھی کوئی خرابات کا فسانہ ہوں
سبوکشی سے مری تجھ کو احتمال ہؤا
کہ میں طرب کی روایات کا نشانہ ہوں

تو سوچتا ہے میں عیش و طرب پہ مائل ہوں
اِسی لئے مئے رنگیں کے گیت گاتا ہوں
یہ دونوں غم کو مٹانے کی کوششیں ہی تو ہیں
تو نالے کرتا ہے میں قہقہے لگاتا ہوں

تجھے خزاں کی سیہ کاریوں نے گھیرا ہے
میں ان حدود میں محبوس ہو نہیں سکتا
ہزار بار جو اس گلستاں سے پھوٹی ہیں
میں ان بہاروں سے مایوس ہو نہیں سکتا

خدارا تلخیٔ دوراں کی داستاں نہ سنا   حدیثِ جام مئے خوشگوار کہنے دے
ابھی سلگتے ہوئے آنسوؤں کا ذکر نہ چھیڑ
ابھی ستاروں کی دنیا میں مجھ کو رہنے دے

بیاں نہ کر ابھی ہوش و خرد کے افسانے
ابھی جنوں کی حکایات سن رہا ہوں میں
ابھی سے موت کا فتویٰ، کچھ انتظار تو کر
ابھی جہاں کی شکایات سن رہا ہوں میں

○

تاج محل

جگمگاتا ہوا ایوان، منوّر مینار — جیسے انگڑائیاں کرنوں کی مجسّم ہو جائیں
جیسے بہتی ہوئی چاندی میں کنول کا پرتو
جیسے کلیاں جو سرِ شام سمٹ کر سو جائیں

خواب زاروں سے چرائے ہوئے جنت کے نقوش — نقرئی لہروں میں ہیرے کے ستوں بہتے ہیں
یہ بھڑکتے ہوئے گنبد یہ ضیا تابِ مزار
اسی شعلے کو مگر تاج محل کہتے ہیں

مجھکو تسلیم ہے فردوسِ نظر ہے یہ مقام — اک شہنشاہ کے احساس کا ایثار ہے یہ
پیار کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں
مرمر و سیم سے آسودہ مگر پیار ہے یہ

شہرتِ خام نے مارا تجھے اے حسنِ تمام — قصرِ شاہی کے مکیں رسمِ وفا کیا جانیں
شان و شوکت کے عوض تو نے محبت بیچی
تو نے برسائیں کمانوں سے سنہری تانیں

رشک کرتی ہے تیرے بختِ رسا پہ دنیا — کہ تیری لاش کو بھی مقبرہ شاہانہ ملا
مجھکو افسوس یہ ہوتا ہے کہ لیلائے وفا — تجھکو مجنوں سا کوئی چاہنے والا نہ ملا

ملے وہ روزِ ازل جوہرِ حیات مجھے
مٹا سکے نہ زمانے کے حادثات مجھے

بلا رہا ہے ہر اک شعبۂ حیات مجھے
اٹھائے پھرتی ہے آنکھوں پہ کائنات مجھے

عطا ہوئی ہے وہ بیداریٔ نگہ مجھ کو
کہ آ رہے ہیں نظر صاف شش جہات مجھے

تمہاری یاد نے آسان زندگی کر دی
کھٹک رہی تھی گراں باریٔ حیات مجھے

نہ جانے وحشتِ دل لے گئی کہاں فارغ
نظر بھی آئی نہ حدِ تعینات مجھے

احساس

میں نے خوابوں کے شبستاں سے نکل کر اے دوست
جب حوادث کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالیں

جس جگہ پیکِ تخیّل کی کمندیں نہ گئیں
اس بلندی پہ مرے عزم نے باہیں ڈالیں

چھوٹے سپنوں کے اندھیروں میں جو دم گھٹنے لگا
مشعلِ حسنِ عمل دل میں جلائی میں نے

زورِ گفتار سے تقدیر کا جب رُخ نہ پھرا
بڑھ کے کردار کی شمشیر اٹھائی میں نے

میری دنیا غم و آلام کی دنیا تو نہیں
میری دنیا میں محبت کے ستارے بھی تو ہیں

میرا ماحول سسکتا ہوا ماحول نہیں
اسی ماحول میں پُرکیف نظارے بھی تو ہیں

مجکو معلوم ہے کرنوں کی جوانی کا فسوں
چاندنی رات میں رقصاں نظر آتی ہے حیات

آبشاروں کا ترنم بھی سنا ہے میں نے
یاد ہیں مجھ کو بہاروں کے رسیلے نغمات

کتنے غنچے میرے آغوش میں ہی پھول بنے　　قہقہوں سے کیا گلشن میں چراغاں میں نے
کتنی ایسی بھی ہیں کلیاں کہ کئی برسوں تک
جنکو سکھلائے ہیں آدابِ گلستاں میں نے

غور سے دیکھا تو ہر پھول کے نازک دل میں　　غمِ انجام کا ناسور نظر آتا ہے
اور کانٹا جو اُلجھنے کو نمودار ہوا
اپنے ماحول میں مسرور نظر آتا ہے

میں نے ماضی کے طربناک فسانے بھی سنے　　جن سے اِک عہدِ دلآویز کی بو آتی ہے
اور مستقبل رخشاں کا تصور بھی کیا
جس کی دوشیزگی آغوش کو گرماتی ہے

حال کے پردوں میں جھانکا تو مجھے ہول آیا　　غم میں ڈوبی ہوئی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنے خوابوں کے شبستاں میں جو دیکھا میں نے
چند آسودہ گناہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

انحراف

پہلے تیری الفت کا اعلان کیا میں نے
احساس جوانی کو عریان کیا میں نے

کب اتنی فروزاں تھی مشعل یہ نگاہوں کی
ارمان چراغاں کا سامان کیا میں نے

آنکھوں کے شبستاں میں تزئین نظر کب تھی
اس حسن نمائش کا احسان کیا میں نے

کب یوں نظر افزا تھی زلفوں کی سیہ مستی
راتوں کی ملاحت کو قربان کیا میں نے

بے ربط اداؤں میں یہ ربط اثر کب تھا
بکھرے ہوئے پاروں کو قرآن کیا میں نے

کب تجھ میں سلیقہ تھا پندارِ خدائی کا
جب تجھ کو پرستش کا عنوان کیا میں نے

ہر شعبۂ تمکیں کا آغاز ہوا مجھ سے
اک نرم سے جھونکے کو طوفان کیا میں نے

اب زخم نہ دے دل پر چرکے نہ لگا مجھ کو
منظور نہیں ایسا بے درد خدا مجھ کو

○

خرد بھی نا مہرباں رہے گی، شعور بھی سرگراں رہے گا

ان آندھیوں میں مرا جنونِ وفا مگر ضوفشاں رہے گا

بدل سکے گی نہ فطرتِ سرکشی کو یہ گردشِ زمانہ

ازل سے جو آسماں بنا ہے ابد تلک آسماں رہے گا

الجھ الجھ کر مجھے حوادث کی تند لہروں سے کھیلنے دو

فسردہ ساحل کا خشک ماحول مجھ کو بارِ گراں رہے گا

ابھی سے میری نگاہیں اس دَور کے تصوّر کو چھو رہی ہیں

بجھی بجھی بیکسوں کی آہوں پہ بجلیوں کا گماں رہے گا

غریب انساں کی خودی کو بغاوتیں گدگدا رہی ہیں

نہ یہ جبیں اب جبیں رہے گی نہ آستاں آستاں رہے گا

○

○

حیات کی تلخیوں کو جام و سبو سے شیریں بنا رہا ہوں
الم کے تیروں سے دل ہے چھلنی لبوں کو نغمے سکھا رہا ہوں

زمانہ درد آشنا ہی کب تھا جہاں میں ذوقِ وفا ہی کب تھا
جنوں تھا مجھ کو جو اپنی ناکامیوں پہ شکوہ سرا رہا ہوں

جو قصرِ شاہی تباہ کر دے، جو بے نواؤں کو شاہ کر دے
غریب کے آنسوؤں میں ان زلزلوں کی آہٹ سی پا رہا ہوں

غلام قوموں سے جا کے کہہ دو کچھ اور دن کلفتیں بہ سہہ لو
نیا زمانہ ہے نام اور انقلاب بن کر میں آ رہا ہوں

نحیفِ انساں کا غم لئے ہوں، بغاوتوں کا عَلَم لئے ہوں
گئے وہ دن اے ندیم جب میں اسیرِ زلفِ دوتا رہا ہوں

شعور کی ملگجی فضاؤں میں قلبِ فطرت دھڑک رہا ہے
خرد کے ظلمتکدے میں فارغ جنوں کی مشعل جلا رہا ہوں

○

فیصلہ

عنبریں زلفیں حسیں باہیں نشیلی آنکھیں   کس قدر دامِ تصور نے بچھا رکھے ہیں

یہ محلات، یہ ایواں، یہ شبستانِ جمال
کتنے معبود زمانے نے بنا رکھے ہیں

خواجہ و بندہ کی تفریق کبھی مٹ نہ سکی   آدمیت کو یہی ناگ سدا ڈستا ہے

سخت جانوں کے پسینے سے چھلکتے ہوئے جام
دیکھ! کس درجہ غریبوں کا لہو سستا ہے

وہی غربت کا جہنم وہی فاقوں کے شرار   ان خداوندوں کے قانون میں ترمیم نہیں

یہ کھنکتے ہوئے سکے، یہ حریری ملبوس
شکر ہے مجھ میں امارت کے جراثیم نہیں

کیوں بتوں کی طرح، ہونٹوں پہ رہے مہرِ سکوت   میری آواز دبانے سے نہیں دب سکتی

صاف کہتا ہوں کہ اب تو یہ مچلتی ہوئی بھوک
موت کی دھمکیاں کھانے سے نہیں دب سکتی

گردشِ شام و سحر ختم نہیں ہونے کی   موت بھی بحرِ حوادث کا کنارا تو نہیں
خودکشی کس لئے؟ لڑ لڑ کے جیئے جاؤں گا   زندگی عیش پرستوں کا اجارا تو نہیں

وقت کا راگ

اٹھو کہ وقت کا سیلاب رک نہیں سکتا
تمہاری روح کا ہے انتظار گردوں پہ
جہاں کسی کی مشیت پہ جھک نہیں سکتا
رہے گا تابکجا خود فریبیوں کا اثر

یہ حزن و یاس میں ڈوبا ہوا گلہ کب تک — نیاز و عجز سے آلودہ مدعا کب تک
مٹے مٹے ہوئے ڈھونڈو گے نقش پا کب تک — رہے گا تم کو یہ مبہم سا آسرا کب تک

جمود کا نہ اگر ساتھ تم سے چھوٹے گا
یہ بے حسی یہ سکوں دور ہو نہیں سکتا
طلسم خواب کا گر سلسلہ نہ ٹوٹے گا
جہاں تمہارے لئے وقت کھو نہیں سکتا

یقیں نہیں کہ تھمے آسماں تمہارے لئے — فضائیں یوں نہ رہینگی جواں تمہارے لئے
رکا رہے گا نہ یہ کارواں تمہارے لئے — نہ انتظار کرے گا جہاں تمہارے لئے

تمہاری روح کا ہے انتظار گردوں پر
اُٹھو اور اٹھ کے ذرا حالت وطن دیکھو
رہے گا تا بکجا خود فریبیوں کا اثر
تمہارے حال پہ ماضی ہے خندہ زن دیکھو

زیان و سود سے نظم ہاتھ اب اٹھا کے اُٹھو
جنوں کے نام پہ پندار کو لٹا کے اُٹھو
فسانہ ہائے سلف یک قلم بھلا کے اُٹھو
نقوش ماضی مرحوم کو مٹا کے اُٹھو
اٹھو کہ وقت کا سیلاب رک نہیں سکتا

○

فخرِ ہندوستاں

(بہار اور نواکھالی کے فسادات سے متاثر ہو کر)

کتنی جدت ہے تیری تہذیب کی رفتار میں
کتنا دم خم ہے تری بہکی ہوئی تلوار میں
کشتوں کے پشتے لگے ہیں کوچہ و بازار میں
دیکھ وہ اہلِ وطن کے خون کی ندی رواں
فخرِ ہندوستاں

آگ کی لپٹوں سے سارا دیس ہے دہکا ہوا
ہے مئے نفرت سے ہر اک نوجواں بہکا ہوا
اک تعصب کے جنوں کا پھول ہے مہکا ہوا
ہو چکا ہے سرنگوں کب سے ترا قومی نشاں
فخرِ ہندوستاں

پھولنے پھلنے لگیں تیری روایاتِ کہن
ہو گئی دہشت زدہ سب انجمن کی انجمن
وقفِ تاراجِ خزاں ہے پھر اخوت کا چمن
اتحادِ باہمی کی اُڑ رہی ہیں دھجیاں
فخرِ ہندوستاں

ہر طرف پھر دیر و کعبہ کے اکھاڑے جم گئے
قوم کی تعمیر کے احسن ارادے تھم گئے
گر یہی اطوار ہیں تیرے تو لے پھر ہم گئے
تلخ ترا احساس ہے، انسانیت ہے خونچکاں
فخرِ ہندوستاں

اپنے پہلو میں جگہ دی تو نے استبداد کو — کر دیا مضبوط استعمار کی بنیاد کو
سر بکف ہر دم رہا اغیار کی امداد کو — اِک بھیانک سی حقیقت ہے یہ تیری داستاں
فخر کر ہندوستاں

دشمنِ ملک و وطن کے نارد ہاتھوں میں کھیل — عمر بھر ناکام رہ، سختی اٹھا، آرام جھیل
حریت کے دور کو ماضی کے غاروں میں دھکیل — پھر پہن محکومئ اغیار کا طوقِ گراں
شرم کر ہندوستاں

آزادی کے بعد

سنہ ۱۹۴۷ء تا سنہ ۱۹۵۱ء

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء

سالہا سال کی تاریک فضاؤں میں ندیم جب افق سے کہیں امید کی کرنیں برسیں
اُمڈ آیا وہیں ظلمات کا سیلاب عظیم
زندگی بخش اجالے کو نگاہیں ترسیں

پھر فلک پر وہی تاریک گھٹائیں چھائیں اسی ظلمت نے وہ ماحول میں دم گھٹنے لگا
دیکھ کر بجھتی ہوئی فکر و عمل کی قندیل
مسکراتے ہوئے لمحات نے منہ پھیر لیا

پھر گلستاں پہ خزاؤں نے تسلط پا کر لالہ و گل کی روایات کو برباد کیا
وہ ستم ٹوٹے کہ ہر غانِ چمن نے رو کر
اپنے گزرے ہوئے صیاد کو پھر یاد کیا

یوں چمن زار کو گلچینوں نے تاراج کیا کوئی غنچہ کوئی گل کوئی کنول کھل نہ سکا
آج تک کتنے پرستار تھے آزادی کے وقت پر کوئی بھی ہمدردِ وطن مل نہ سکا
کوئی ہندو کوئی سکھ، کوئی مسلماں نکلا
ایک چالیس کروڑوں میں نہ انساں نکلا

پُکار

یہ سیلابِ خوں یہ بھیانک جھکولے افق سے یہ ملتا ہوا تیز دھارا
کوئی ناخداؤں سے اتنا تو پوچھے
کہاں ہے کنارا، کدھر ہے کنارا

وہ مہتاب کا دیپ گل ہو رہا ہے اکھڑنے لگا ہے وہ کرنوں کا ڈیرا
وہ دم توڑتے ہیں فلک پرستارے
وہ امواجِ ظلمت میں ڈوبا سویرا

مجھے یاس سے اب بھی نفرت ہے لیکن سہارا کوئی زندگی کا نہیں ہے
میں مرنے سے اب بھی گریزاں نہیں ہوں
سوال اب مری موت ہی کا نہیں ہے

بغاوت کا میں دل سے قائل ہوں لیکن لفنگوں کی غارت گری کیسے دیکھوں
اگرچہ ہے فطرت مری انقلابی
مگر قوم کی خودکشی کیسے دیکھوں

جنونِ تعصب کا ہے اب یہ عالم کہ انسانیت کے گلے کٹ رہے ہیں
جو اخلاق کے مدعی تھے جہاں میں وہ اخلاق کی راہ سے ہٹ رہے ہیں

غریبوں کے مظلوم دل میں اتر کر فضا میں چمکتی ہے تلوار دیکھو
سنو بینواؤں کی دل دوز آہیں
وہ معصوم لاشوں کے انبار دیکھو

جو ملّت کو آزاد کرنے اٹھے تھے وہ محکوم کرنے پہ اس کو تلے ہیں
وہ دھرتی کبھی جو کہ جنّت نشاں تھی
جہنّم کے اس میں دہانے کھلے ہیں

جو تعمیر کی فکر میں گھل رہے تھے وہ تخریب کا بیج بونے لگے ہیں
جنہیں ناخدائی کا عرفاں ہوا تھا
وہی اب سفینہ ڈبونے لگے ہیں

جواب ہم جلیسوں سے ٹکرا رہے ہیں انہیں غیر سے جنگ کرتے نہ دیکھا
یہ آپس میں لڑ کر جو جاں دے رہے ہیں
وطن کے لئے ان کو مرتے نہ دیکھا

یہ نیزے، یہ بھالے، یہ آہیں، یہ نالے میں حیراں ہوں دنیا میں کیا ہو رہا ہے
عَلم کون امن و اماں کا سنبھالے
کہ اس سرزمیں کا خدا سو رہا ہے

○

قافلے آتے رہے اور قافلے جاتے رہے

سب انہیں فرسودہ افسانوں کو دہراتے رہے

آخر آغوشِ سحر میں ان کو بھی نیند آ گئی

رات بھر جو صبر کی تلقین فرماتے رہے

زندگانی کے تقاضوں سے نہ ہم غافل ہوئے

انقلاباتِ زمانہ لاکھ سمجھاتے رہے

زندگی کی دھڑکنوں کو جس نے تھا جکڑا ہوا

آپ بھی ہم کو وہی زنجیر پہناتے رہے

ہم کو ہی کوئی زمانہ راس آسکتا نہیں

آپ تو ہر عہد کے سانچے میں ڈھل جاتے رہے

ہیں حقیقت میں وہی معمارِ عصرِ نو کہ جو

زندگانی کی نئی قدروں کو اپناتے رہے

اب کھلا فارغ خزاں تو مفت میں بدنام تھی

فصلِ گل کے عہد میں بھی پھول مرجھاتے رہے

آزادی سے پہلے آزادی کے بعد

ہم اُجلے خوابوں کے رنگیں محل بناتے رہے
ہم آرزوؤں کے ایوان کو سجاتے رہے
ہم اپنی دولتِ احساس کو لٹاتے رہے
امیدِ فردا پہ کیا کیا فریب کھاتے رہے

وطن کو اجنبی سانسوں سے ہم نے پاک کیا
ستم کشوں کا نشیمن جلا کے خاک کیا
جگر کے سوز سے ماحول تابناک کیا
نظر سے دامنِ تیرہ شبی کو چاک کیا

اِک عمر تک غم و آلام میں بسر کی ہے
قفس میں رہ کے تمنائے بال و پر کی ہے
تمام رات تڑپ کر کہیں سحر کی ہے
شکایت آج بھی محرومیٔ نظر کی ہے

یہ صبحِ نو ہے اگر اس قدر اداس ہے کیوں
دلوں میں درد نگاہوں میں حزن و یاس ہے کیوں
کلی کلی کو ابھی رنگ و بو کی پیاس ہے کیوں
کرن کرن کا ملاکٹ فقرا لباس ہے کیوں

وہی ہے نغموں کا سیلاب بارگاہوں میں　　وہ عصمتوں کی تجارت ہے شاہراہوں میں

وہ جھولتا ہے کوئی مرمریں سی باہوں میں

وہ اشک امڈے ہوئے ہیں کئی نگاہوں میں

ابھی بساطِ غمِ روزگار بھی ہے وہی　　فسوں طرازیٔ لیل و نہار بھی ہے وہی

غریب بھی وہی سرمایہ دار بھی ہے وہی

دلوں کا نالۂ بے اختیار بھی ہے وہی

کوئی نہیں کہ غمِ ہجر کے اسیروں کو　　یقیں دلائے کہ فرقت کی رات ختم ہوئی

جو پھول آج بھی مرجھا رہے ہیں کیا جانیں

بہار آئی خزاؤں کی بات ختم ہوئی

تشنگی

کتنی مسرور تھی امید کی دولت پا کر
شادمانی کے کنول آنکھوں میں لہراتے رہے
رقص کرتا ہوا ماحول بسایا تو نے
مسکراتی ہوئی دنیا کے خیال آتے رہے

خود فریبی نے تصور کے حسیں جال بنے
جو تیری فطرتِ احساس کو بہلاتے رہے

تو نے بڑھتے ہوئے سایوں سے پناہیں مانگیں
ایک آوارہ کرن کو بھی غنیمت جانا
غم و اندوہ کی تعبیر شکن دنیا میں
جھوٹے خوابوں کے چمن کو بھی غنیمت جانا

ہر طرف یاس کی تاریک گھٹائیں پا کر
فرحتِ چشم زدن کو بھی غنیمت جانا

اپنی معصوم دعاؤں کی یہ تاثیر بھی دیکھ
اب ترے درد کی تکمیل ہوا چاہتی ہے
گھٹ کے رہ جائیں بہاروں کے ترانے جن میں
ایسے زندانوں کی تشکیل ہوا چاہتی ہے

جس کرن کو تیری نظروں نے سہارا سمجھا
وہ بھی اب سایوں میں تحلیل ہوا چاہتی ہے

وہ ارادے جو امنگوں کے نگہبان رہے
آج خود بے کس و لاچار نظر آتے ہیں
لہلہاتے تھے جو کل شانِ دلآویزی سے
آج وہ پھول بھی بیمار نظر آتے ہیں

تُو تو افلاس سے بھاگ آئی تھی لیکن اب تو
ہر طرف قحط کے آثار نظر آتے ہیں

○

زندگی وقفِ غم و آلام ہو کر رہ گئی
ہر مسرّت اِک خیالِ خام ہو کر رہ گئی

اوّل اوّل وہ نظر اِک بادۂ گلفام تھی
آخر آخر اک شکستہ جام ہو کر رہ گئی

گیسوئے مشکیں کی چھاؤں کس قدر تھی پُرسکوں
رفتہ رفتہ یہ گھٹا بھی دام ہو کر رہ گئی

کتنے تاروں کی ہلاکت سے ہوئی جسکی نمود
حیف ہے وہ صبح نو الزام ہو کر رہ گئی

وہ کرن ظلمت شکن ہونے کا دعویٰ تھا جسے
وقت پر اِک کوشش ناکام ہو کر رہ گئی

پہلے فارغ تھا فقط تیری جفاؤں کا شکار
لیکن آخر یہ حکایت عام ہو کر رہ گئی

تعمیر

نقرئی کرنوں سے ماحول کو آباد کر دو
تیرہ و تار فضاؤں کے لبادے بدلو
ناتواں قلب میں فولادی عزائم بھر دو
ڈگمگاتے ہوئے بیمار ارادے بدلو
نئی راہیں، نئے خاکے، نئی منزل ڈھونڈو
کہنہ اقدار کے پامال سے جادے بدلو

رات بھر تم کو اندھیروں سے الجھنا ہوگا
یہ نہ سمجھو کہ سحر خیز ستارے ہو تم
کتنے گرداب ابھی پھاندنے ہونگے تم کو
کون کہتا ہے کہ آسودہ کنارے ہو تم
کتنے ناشاد دلوں کو ہے مسرت تم سے
کتنی مایوس نگاہوں کے سہارے ہو تم

ابھی آغازِ سفر ہے ابھی رکنا کیسا
ولولے تازہ رہیں ہمتیں رخشندہ رہیں
ایسے ماحول کی تخلیق کا سامان کرو
جس سے تاریخ کے اوراق بھی تابندہ رہیں
ایسی رفتار سے گذرو کہ نقوشِ کفِ پا
نئی نسلوں کی قیادت کیلئے زندہ رہیں

کوئی پیغام دو ایسا کہ ہو احساسِ حیات
شعبدہ بازی کا افسوں نہ دکھاتے جاؤ
مسکراہٹ کو ترستا ہے ضمیرِ آدم
درد اور غم کے ہیولوں کو مٹاتے جاؤ
کسی معقول سی تعمیر کا اقدام کرو
یونہی مٹی کے گھروندے نہ بناتے جاؤ

کچھ اِس انداز سے حالات پہ تنقید کرو
جابجا کیف چھلکتا رہے افسانے کا
پینے پینے میں ہی رِندوں کو وہ احساس دلاؤ
خود بخود رنگ بدلنے لگے میخانے کا
ابھی الطاف کی پریوں کی اڑانیں دیکھو
وقت آجائے گا تلوار بھی لہرانے کا

○

ہوئے ہیں سرد و ماغوں کے دہکے الاؤ
نفس کی آنچ سے فکر و نظر کے دیپ جلاؤ
کرن کرن کو سیہ بدلیوں نے گھیر لیا ہے
تصورات کے دھندلے چراغو راہ دکھاؤ

کہاں ہے گردشِ دوراں کدھر ہے سیلِ حوادث
سکونِ مرگِ مسلسل میں ڈوبنے لگی ناؤ
کبھی خزاں کے بگولے کبھی بہار کے جھولے
سمجھ سکے نہ زمانے کے یہ اتار چڑھاؤ

عجیب سا ہے خرابات کے فقیہوں کا فتویٰ
بھڑکتے شعلوں سے تپتے دلوں کی پیاس بجھاؤ
ہزار گردنیں خم ہوں برا نہیں یہ ستم ہے
خیال و فکر کی پستی، نگاہ و دل کا جھکاؤ

رنگ در رنگ حجابات اٹھانے ہونگے
بے محابا ہمیں سب جلوے دکھانے ہوں گے

جن کو تاریخ کی نظریں بھی کبھی چھو نہ سکیں
بطنِ گیتی میں کئی ایسے زمانے ہوں گے

جن کو الفاظ کا جامہ کوئی پہنا نہ سکا
غالباً کتنے ہی ایسے بھی فسانے ہوں گے

عمر بھر تیروں کے سینوں میں جو پیوست رہے
کئی ایسے بھی ہدف سوز نشانے ہوں گے

آج تک شاہوں کی تحویل میں جو آ نہ سکے
سینکڑوں ایسے پُر اسرار خزانے ہوں گے

پشت ہا پشت سے جو دستِ نگر رہتے ہیں
ان گنت ایسے بھی مظلوم گھرانے ہوں گے

جن میں غربت کے اسیروں کو جگہ مل نہ سکی
وہ فلک بوس محلات گرانے ہوں گے

جن میں دہقانوں کی حسرت کا لہو چھلکتا ہے
ہم کو وہ گلشنِ شاداب جلانے ہوں گے

نئے انداز سے چھیڑی ہے غزل فارغ نے
اب ہر اک لب پہ بغاوت کے ترانے ہونگے

بغاوت

آہنی عزم سے میداں میں اُتر آیا ہوں
دہشتیں اب میری باہوں کو نہیں کس سکتیں
شوق سے آپ اُلٹ دیں مہ و انجم کی بساط
ظلمتیں میری نگاہوں کو نہیں ڈس سکتیں

تا بکے میرے تڑپنے پہ ہنسے گی دُنیا
خونفشاں آہوں سے نغمات بنیں گے کب تک
میری محنت سے امیروں کی رہائش کے لئے
سونے چاندی کے محلات بنیں گے کب تک

توڑنے دو یہ روایات کی اقدار کا جال
مجھ کو تقدیر کے پنجے سے رہا ہونے دو
مدتوں مجھ پہ زمانے نے خدائی کی ہے
اپنی تقدیر کا اب مجھ کو خدا ہونے دو

چاک کر ڈالوں گا میں مصلحتوں کا دامن
آگ میں کودوں گا میں خون سے کھیلوں گا میں
حادثے میرے تہوّر سے لرز جائیں گے
وقت کی باگ کو اب ہاتھ میں لے لونگا میں

مل چکا ہے ہمیں آزادی کا پیغام مگر
انقلابات کا آغاز تو اب ہونا ہے
اب بغاوت کے جنوں زار میں ڈھل کر ہم کو
باعثِ برہمیٔ بزمِ طرب ہونا ہے

اجنبی شاہوں کے بُت ٹوٹ چکے ہیں لیکن!
اونچے ایوانوں کی عظمت کا صنم باقی ہے
مٹ چکا حادثۂ غلغلۂ اہلِ ہوس
فتنۂ شورشِ اربابِ کرم باقی ہے

یاد دہانی

ایوانوں میں بسنے والو
کٹیاؤں پہ ہنسنے والو
سونے چاندی کے ناگوں سے
مزدوروں کو ڈسنے والو
معبودوں کے پیارے ہو تم
دھن کی آنکھ کے تارے ہو تم
کل بھی راج دلارے تھے تم
آج بھی راج دلارے ہو تم
اونچے اونچے محل تمہارے
استادہ ہیں جن کے سہارے
دیکھو اب بھی سلگ رہے ہیں
سینوں میں لے کر انگارے

برکھا رت نے دھن برسایا
پلٹ گئی گلشن کی کایا
لیکن بے بس انسانوں کو
یہ موسم بھی راس نہ آیا

ہم نے لاکھوں صدمے جھیلے
آن سے گذرے جان پہ کھیلے
تم کو تو معلوم ہی ہو گا
کیسے کیسے پاپڑ بیلے

ہم نے ہی زنداں بسائے
ظلم سہے دُکھ درد اٹھائے
ہم نے ہی سینوں پہ ہنس کر
اہلِ ستم کے بھالے کھائے

اور جب ہم اغیار سے چھوٹے
قہر ستم اپنوں کے ٹوٹے
تم نے جو جو ہم سے کئے تھے
نکلے سارے وعدے جھوٹے

کوئی چیخے یا کرلائے
درد کی شدّت سے مر جائے
تُوندوں کو تم بھرتے جاؤ
بھوک کی جنتا بھاڑ میں جائے

لیکن اے اندھے آقاؤ
اِن لمحوں کو بھُول نہ جاؤ
جب یہ دھیمے دھیمے شعلے
بن جائیں گے تیز الاؤ

قصرِ شاہی جل جائے گا
وقت کا جادو چل جائے گا
جمہوریّت کے سانچے میں
سارا عالم ڈھل جائے گا

○

حقیقتوں سے فرار کب تک یہ خوابِ غفلت ہے مجرمانہ
وہ قوم مٹ کر رہی ہے جس نے حقیقتوں کو اٹل نہ جانا

وہ پو پھٹی وہ ہوا اجالا، نظامِ انوار نے سنبھالا
مگر سحر کی سنہری کرنوں میں ہے وہی تیرگی کا شانہ

وہ دورِ صد اضطراب جاتا رہا میں کیسے یقین کر لوں
نیازشِ بندگی وہی ہے، وہی خداؤں کا آستانہ

وہی سلگتے ہوئے سے سینے وہی ہیں ادبار کے پسینے
نجانے کس سمت کو ہے ابرِ کرم کا یہ قافلہ روانہ

یہاں بھی طاغوتی طاقتیں اک نئی ادا سے ہیں جلوہ فرما
بہت سناتی تھی ہم کو دنیا افق کے اس پار کا فسانہ

معاف کیجیے میں ایسے گلشن کی رنگ و بو کا نہیں ہوں قائل
کہ جس کے نزہت فروش دامن میں خاص طبقے کا ہو ٹھکانہ

نہ جانے وہ عہدِ سرمدی کس سمپیر نو کا منتظر ہے
زمانہ کب سے پکارتا ہے، نیا زمانہ ! نیا زمانہ !!

تقاضا

ذہن انساں پہ ہے صدیوں کی رِوایات کا بوجھ
اِن دھندلکوں سے بھلا اِس کو ابھاروں کیسے

وہی طغیانِ حوادث وہی طوفانِ بلا ——
اِن خزاں دیدہ بہاروں کو نکھاروں کیسے

بارگاہوں کی بلندی کو تو میں پھاند ہی لوں
دل کو اِن تنگ خلاؤں سے گزاروں کیسے

اِس سلگتے ہوئے ماحول میں رہ کر اے دوست
اپنے آشفتہ خیالات سنواروں کیسے

توڑ کر کتنے حصاروں کو چلا آیا ہوں
ہر قدم پر ابھی دیواریں ہی دیواریں ہیں

زندگی سوز تعفن کے خرابے ہیں یہاں
اور وہاں زلف سیہ مست کی مہکاریں ہیں

آستانے بھی وہی، سر بھی وہی در بھی وہی
وہی زنداں وہی زنجیروں کی جھنکاریں ہیں
وہی سینے ہیں وہی نقرئی خنجر کی انی
وہی حلقوم وہی سونے کی تلواریں ہیں
میں ابھی اپنی تگ و تاز سے مایوس نہیں
میرے بیباک ارادوں میں توانائی ہے
بجھ نہیں سکتی کبھی میرے جنوں کی مشعل
میں نے ظلمت کو مٹانے کی قسم کھائی ہے
میرے اشعار نہیں اہلِ جہاں کی ہے پکار
میرے نغمات نہیں وقت کی شہنائی ہے
غور سے سن اسے جمہور کی آواز ہے یہ
اِک نئے دَور کا اب دہر تمنائی ہے

○

ثواب

رکا رکا سا خرام کیسا، جھکی جھکی سی نگاہ کیوں ہے؟
نحیف و درماندہ جرأتیں کیوں ہیں بےبسی بےپناہ کیوں ہے؟
شباب کے معصیت کدے میں سبکسری سے نباہ کیوں ہے؟

نہ جاؤ اخلاق کے خداؤں کی منطق خام پر نہ جاؤ
گناہ کیسا یہ سودا بازی ہے محض اوہام پر نہ جاؤ
جنوں کی خلوت سرا میں اترو، شعور کے بام پر نہ جاؤ

قریب آؤ گداز باہوں کا ہار گردن میں ڈال دونگی
اداس ماضی کی بستیوں کو فراز مہ تک اچھال دونگی
دلِ حزیں کی بجھی بجھی حسرتوں کے چہرے اجال دونگی

نفس نفس میں شراب کی گرمیاں نہ محسوس ہوں تو کہنا
نظر نظر میں دماغ و دل کی نقاہتیں دور ہوں تو" رہنا"
ہوس کی تسکیں کا خواب دیکھو نہ پوچھو کیوں یہ لباس پہنا

میری جوانی کی وسعتوں پہ شفق ابھی پھوٹ ہی رہی ہے
مدام میری جبیں پہ ویران صبح کی چھوٹ ہی رہی ہے
ملا تو قصرِ جمال لیکن نصیب میں لوٹ ہی رہی ہے

قدم بڑھاؤ مچلتے ہاتھوں میں اِک چھلکتا سا جام دے دو
شباب کے مضمحل ارادوں کو آج اذنِ خرام دے دو
خرید لو میرا جسم اور مجھ کو پیٹ بھرنے کو دام دے دو

بڑھو بڑھو سوچتے ہو بیکار آبھی جاؤ ثواب ہو گا
چمکتے سکوں کی لے کے جھنکار آبھی جاؤ ثواب ہو گا
کئی دنوں سے ہے سرد بازار آبھی جاؤ ثواب ہو گا

○

خیبر

میری سنگین چٹانوں کو حقارت سے نہ دیکھ
ان میں خوابیدہ ہے آزادیٔ انسان کا خواب
میرے اجڑے ہوئے منظر کی اداسی پہ نہ جا
اس میں بیدار ہے شاداب بہاروں کا شباب

میرے خاموش سے ماحول کو ویراں نہ سمجھ
کہ جنم عظمتِ آدم کو دیا ہے اس نے
ایسی تہذیب سے بیگانہ ہی اچھا ہوں میں
آدمیت کو فراموش کیا ہے جس نے

انقلاباتِ جہاں کا نہ ہوا مجھ پہ اثر
سربلندی میری ہر دور میں تابندہ رہی
کتنے شاہوں کے نشاں تک نہ زمانے میں رہے
آج تک غیرتِ افغان مگر زندہ رہی

سامراجوں نے یہاں دام بچھائے کیا کیا
کسی قیمت پہ مگر مجھ کو خریدا نہ گیا

آستاں لاکھوں میری راہ میں آئے لیکن
سرِ شوریدہ کسی در پہ مگر جھک نہ سکا

مجھ کو محکومی کے ماحول سے نفرت ہی ہی
میری گھٹی میں ہی احساسِ سپہیانہ پڑا

کتنی یلغاروں کا سیلاب یہاں سے گزرا
آج تک مجھ پہ کسی تاج کا سایہ نہ پڑا

اپنی درماندہ روایات پہ دل شاد ہوں میں
کل بھی آزاد تھا میں آج بھی آزاد ہوں میں

○

مغویہ

میں وہی ہوں کہ جسے آپ کہا کرتے تھے
تو مرے بھولے ہوئے خوابوں کی شہزادی ہے
تیری سانسوں نے میری زندگی مہکا دی ہے

میں وہی ہوں کہ جسے آپ کہا کرتے تھے
میری ہمشیر تو ہے شرم و حیا کی دیوی
عفت و عصمت و ناموس و وفا کی دیوی

میں وہی ہوں کہ جسے آپ کہا کرتے تھے
میری بچی مہ و انجم سے بھی رخشندہ ہے
یہ تو معصوم بہاروں کی نمائندہ ہے

میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے دیکھا تو کہا
اونچے گھر کے کسی شوہر کیلئے مرتی ہے
ہم شریفوں کو یہ بدنام عبث کرتی ہے

میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے دیکھا تو کہا
جنموں میں میری ہمشیر چمن آرا ہے
اسے لے جائیے یہ تو کوئی آوارہ ہے

میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے دیکھا تو کہا
میری بیٹی کہاں یہ تو کوئی سودائی ہے
وہ مہکتے ہوئے گلزاروں کی انگڑائی ہے

نہ کمینی ہوں نہ آوارہ نہ سودائی ہوں
نہ نئی ہوں، نہ انوکھی نہ نرالی ہوں میں
اسی کاشانے کے آغوش کی پالی ہوں میں

جانے پھر کون سے ناکردہ گناہوں کے عوض
اسی ماحول میں اب راندۂ و مقہور ہوں میں
آپ کی چشمِ عنایت سے بہت دُور ہوں میں

سوچتی ہوں کہ یقیں کیسے دلاؤں آخر
میں وہی آپ کی اپنی ہوں کوئی غیر نہیں
آپ نے منہ نہ لگایا تو میری خیر نہیں

میرے سرتاج، میرے بھائی، میرے ابّا جان
آپ کی بیوی ہوں، ہمشیر ہوں، بیٹی ہوں میں
یہ الگ بات ہے، تقدیر کی ہیٹی ہوں میں

ترتیبِ نو سے بدلا نہ میخانے کا نظام — جو پہلے تشنہ کام تھے اب بھی ہیں تشنہ کام
آئینِ گلستاں میں تغیر یہ کم ہے کیا — کانٹے بنے ہوئے ہیں گل و لالہ کے امام
آزاد زندگی کہاں اپنے نصیب میں — کل انکے تھے غلام تو آج آپ کے غلام
وہ بھی ہیں میری بادہ گساری پہ معترض — انسان کے لہو سے ہیں لبریز جن کے جام
اب تک وہی قفس ہے وہی ظلمتوں کا دور — یہ صبحِ حریت ہے کہ محکومیت کی شام
ذہنوں کے انقلاب سے بنتی ہے زندگی — مردہ خیال و فکر کو دے زیست کا پیام
برسوں کے اضطراب سے جو کٹ چکی ہے اب — اے دستِ مصلحت اِسی زنجیر کو نہ تھام

اِنسانیت کے نام پہ جو بھینٹ چڑھ گیا
فارغ ہزار بار ہو اِس روح پر سلام

نومولود

(ظفر عباس جان کی ولادت پر)
۱۳۶۷ھ

اے نئے دَور میں آزادیٔ اِنساں کے نقیب
تو یہاں ایسے عناصر کا نمائندہ ہے
جو ابھی فکر و نظر کے لئے محتاج نہیں
جس کی خودداری کا احساس ابھی زندہ ہے

آج آزاد فضائیں ہیں میسّر تجھ کو ــــــ
صحن گلشن میں بہاروں کا چراغان ہے آج
آج برسوں کی غلامی کا فسوں ٹوٹا ہے
حریّت یافتہ نظروں کا تو مہمان ہے آج

شاد ہو شاد کہ اب وقت نے کروٹ لی ہے
آج تو اجنبی سرکار کا محکوم نہیں
آج تک جس کو ترستی تھیں ہماری آنکھیں
ایسی معصوم بصارت سے تو محروم نہیں

دیکھ وہ ظلمتِ دوراں نے سمیٹا دامن
روشنی سی وہ افق زار پہ لہراتی ہے
اک نئی صبح کا آغاز ہوا چاہتا ہے
ٹوٹتے تاروں کی کانوں میں صدا آتی ہے

نئی دنیا، نئے ماحول میں آنے والے
اب نئی قدروں میں ڈھلنا ہے زمانے کا نظام
زندگی ماضی کے غاروں سے نکل آئی ہے
تیرے ہاتھوں میں ہے مستقبلِ رخشاں کی زمام
زندگانی کے تقاضوں سے الجھنے والے
آخر اس بپھرے ہوئے سیل میں بہہ جائیں گے
ساتھ جو دے نہ سکے بڑھتے ہوئے لمحوں کا
رہگذاروں میں ہی دم توڑ کے رہ جائیں گے

○

فردِ جُرم

اے اجالوں کے خداوند ادھر بھی دیکھو
اِک کرن کیلئے محتاج ہیں ہم تیرہ نصیب
آپ تو پہلے بھی رہتے تھے ستاروں کے قریب

یہ بہاریں، یہ سخن زار، یہ شاداب فضا
کیوں سلگتی ہوئی آنکھوں کیلئے عام نہیں
آپ کے ذوقِ وفا کا تو یہ انعام نہیں

ساتھ ہم دے نہ سکے اہلِ زمانہ کا مگر
آپ ہر دور میں ایوان سجا لیتے ہیں
وقت کے بدلے ہوئے ساز پہ گا لیتے ہیں

وقت کے ساتھ ہی پھر آپ نے کروٹ لی ہے
آج بھی آپ کو حاصل ہے وہی عیشِ فراغ
آج بھی آپ کے ہاتھوں میں ہیں قسمت کے چراغ

رہنما قوم کے اب ہیں تو فقط آپ ہی ہیں
کس میں جرأت ہے کہ آج آپکو غدّار کہے
رہِ آزادیٔ جمہور میں دیوار کہے

آپ ملّت کے ہوا خواہ بھی احرار بھی ہیں
اور ہم پانچویں کالم بھی ہیں غدّار بھی ہیں

بازگشت

نظر نظر میں نئی وسعتوں کا ارماں ہے
نگاہ جھک نہیں سکتی ہے ایک مرکز پہ
سکون کیسے میسّر ہو ابن آدم کو
مزاج دورِ زمانہ ہے مثلِ رقصِ شرر
کمال عظمتِ انساں ہے زوال پذیر
کہ دور ہو نہ سکا خود فریبیوں کا اثر
غبار بن کے اُڑا جا رہا ہے غازۂ زیست
ابھر رہا ہے جنوں آج خود نمائی کا
تکلّفات کے پردے اُٹھتے جاتے ہیں
بدلتا جاتا ہے اب زعم پارسائی کا
خلیل بن کے جنہوں نے بتوں کو توڑا تھا
اب انکے دل میں بھی ہے حوصلہ خدائی کا

یہ روشنی کے ستون کس قدر فروزاں ہیں
مگر خود اپنے ہی سائے کو نور دے نہ سکے
یہ رفعتوں کی جبینوں کو چومنے والے
جھکی نگاہوں کو اوجِ غرور دے نہ سکے
مسرّتوں کے سفینوں میں جھومنے والے
بھٹکتی لہروں کو موجِ سرور دے نہ سکے
نگاہیں اپنے ہی محور کے گرد گھومتی ہیں
میں تنگ دامنیٔ جامِ جم پہ حیراں ہوں
ہے محوِ خواب جہاں گیری و جہاں داری
فسونِ باطلِ چشم کرم پہ حیراں ہوں
نجانے کس روشِ خاص پہ ہے ناز اُن کو
مذاقِ شیوۂ اہلِ حرم پہ حیراں ہوں

آزادی کا دوسرا سال

دلِ ناداں دلِ ناداں ہی سہی پر اس کو
کب تلک وعدۂ فردا سے ہی بہلاتے رہیں
تا بکے ہم تیری فرقت میں یونہی جان رقیب
خونِ دل پیتے رہیں لختِ جگر کھاتے رہیں

اب تو اغیار کا کھٹکا بھی نہیں ہے پھر بھی
تیرا اندازِ تغافل نظر آتا ہے وہی
جس کی آواز میں رقصاں ہو طلائی جھنکار
اب بھی اس انجمن ناز میں جاتا ہے وہی

گرچہ اب اجنبی ساحر کا فسوں ٹوٹ گیا
تیرے تیور اسی سانچے میں ڈھلے ہیں اب بھی
سامراجوں کے سہارے پہ جو پروان چڑھے
تیری محدود نگاہوں میں بھلے ہیں اب بھی

دوسرا سال ہے تجدیدِ گلستاں کا مگر
آج تک بدلا نہ کچھ اپنا قرینہ تو نے
اب بھی افسردہ نظر میں وہی مایوسی ہے
مردہ افکار کو سکھلایا نہ جینا تُو نے

دیکھ لے آ کے ذرا اہلِ وفا کا انجام
تجھ میں احساسِ حمیت کی رمق ہے کہ نہیں
جو سدا ہیں رسن و دار کی زینت کے لئے
ان غریبوں کو بھی کچھ جینے کا حق ہے کہ نہیں

وہی تُو ہے وہی پھیلی ہوئی جاگیریں ہیں
کل بھی مزدور تھے ہم آج بھی مزدور ہیں ہم
اب بدل کر ہی رہیں گے یہ ملوکانہ نظام
آج یہ فیصلہ کر لینے پہ مجبور ہیں ہم

○

اپنی موت کی سالگرہ پہ عیش و طرب کے جام لنڈھاؤ
جاؤ اے آزاد غلامو، بربادی کا جشن مناؤ

تم کو خوشی کچھ ہو تو ہو گی میں تو اب تک خوں روتا ہوں
آرائش سے فرصت ہو تو دیکھو میرے دل کے گھاؤ

عزم جو میں لے کر اٹھا ہوں اس میں لغزش آ نہیں سکتی
غیروں نے بھی چن کے لگائے تیرِ ستم تم بھی برساؤ

آج تلک کتنے ہی درندے انسانوں کا روپ لئے ہیں
اپنے گریباں میں منہ ڈال کے دیکھو اتنا دور نہ جاؤ

اچھا ہوا اس دور رہے پر اپنا بیگانہ پہچانا
ورنہ نجانے آگے جا کر کیا ہوتا ان کا برتاؤ

صدیوں کے بعد آج کہیں انسان ذرا بیدار ہوا ہے
کون یہاں اب سنتا ہے تم لاکھ پرانے راگ سناؤ

مرنے والے ہی دنیا میں اپنا مقصد پا جاتے ہیں
جان کی بازی مشکل شئے ہے کون لگاتا ہے یہ داؤ

کھوٹے سکّے

(مفاد پرست دوستوں کے نام)

ٹھیک ہے آپ میرا ساتھ کہاں تک دیتے
یہ حقیقت ہے میرا ساتھ بہت مشکل ہے
مصلحت بھی تو کوئی چیز ہے اِس دنیا میں
مفت میں کیوں کوئی بیکار جھمیلوں میں پڑے
میں تو دیوانہ ہوں دیوانہ ہوں دیوانہ ہوں
کوئی ذی ہوش پہاڑوں سے الجھتا ہے کبھی

بے خطر راہوں میں ہموار گذرگاہوں میں
منزلوں آپ میرے ساتھ چلے آئے ہیں
اب مگر ایسے دوراہے پہ ہم آپہنچے ہیں
کہ ادھر عیش بھی آرام بھی عزت بھی ہے
اور ادھر درد و غم و رنج کا ہے کوہ گراں

میں نے اس راہ سے جانا ہے جو دشوار بھی ہے

میں نے اس راہ سے جانا ہے جو دشوار بھی پرخار بھی ہے

میں نے اِس راہ سے جانا ہے جو دشوار بھی پُرخار بھی ویران بھی ہے

اور اِس راہ میں رہزن بھی ہیں قزاق بھی ہیں

اور اِس راہ میں بھُوتوں کے بسیرے بھی ہیں

اور وہ راہ درندوں کی گذرگاہ بھی ہے

وہ درندے کہ جو انسانوں کا خوں پیتے ہیں

میں تو مجبور رہوں اس راہ سے جانے کیلئے

میں نے دل میں یہ قسم کھائی ہے

کہ میں اِس راہ کو اِنساں کی گذرگاہ بنانے کیلئے

غمِ دشوارئ منزل سے گذر جاؤں گا

آپ شرمائیں نہیں

مصلحت کا یہ تقاضا ہے میرا ساتھ نہ دیں

فن کار کہاں جائیں؟

(پنجاب کے تین ترقی پسند جریدوں کے بند ہونے پر)

انوارِ سحر اب تو قانون کی زد میں ہیں
اربابِ ہنر اب تو قانون کی زد میں ہیں
سب اہلِ نظر اب تو قانون کی زد میں ہیں
تہذیب و تمدّن کے معمار کہاں جائیں؟
فن کار کہاں جائیں؟

ایوانِ حکومت کے ارکان بھی خفتہ ہیں
تقدیر بنانے کے ارمان بھی خفتہ ہیں
دانا بھی ہیں خوابیدہ نادان بھی خفتہ ہیں
لیکن جو ابھی تک ہیں بیدار کہاں جائیں؟
فن کار کہاں جائیں؟

کہتے ہیں کہ ہم فن کی عظمت کے نہیں قائل
خلاق ادیبوں کی عزت کے نہیں قائل
بیباک ضمیروں کی جرأت کے نہیں قائل
یہ اہلِ قلم آخر ہر کار کہاں جائیں ؟
فن کار کہاں جائیں ؟

حق بات کہی جس نے غدار وہ ٹھہرا ہے
ذہنوں کے جھروکوں پہ آئین کا پہرا ہے
اب کس سے شکایت ہو انصاف ہی بہرا ہے
افکار میں حائل ہے دیوار کہاں جائیں ؟
فن کار کہاں جائیں ؟

○

تجربہ

پستیاں چھوڑ کے لپکے تھے فلک کی جانب   سوچتے تھے کہ افق پار سویرا ہوگا
چاند تاروں کے ضیا تاب شبستانوں میں   مسکراتے ہوئے تاروں کا بسیرا ہوگا
مضمحل ذہنوں کو، رنجور تمناؤں کو
نقرئی کرنوں کے سیلاب نے گھیرا ہوگا

سوچتے تھے کہ تخیّل کے سخن زاروں میں   خونِ انساں نہیں محنت کی شفق پھولی ہے
ابلقِ گردشِ ایام نے رُخ پھیرا ہے   چرخ نے اپنی شقاوت کی ادا بھولی ہے
کارواں منزلِ مقصود پہ آ پہنچا ہے
ناتواں ہاتھوں نے یزداں کی جبیں چھو لی ہے

قرب ہونے پہ نگاہوں کو یہ احساس ہوا   آگہی کہتے رہے جس کو وہ گمراہی ہے
جس کو ہم سادہ نظر کہکشاں سمجھے تھے   وہ بھی فسطائیوں کا نقشِ کفِ پا ہی ہے
جذبۂ خدمتِ ملّت میں ہیں اغراض نہاں
پردۂ عظمتِ جمہور میں بھی شاہی ہے

وہ موحد کہ رہی بُت شکنی جن کا شعار　　　انکے افکار نے اصنام تراشے کیا کیا
کہنہ اقدار کی آرائشیں رہ رہ کے ہوئیں　　　جاگ اُٹھے مُردہ روایات کے لاشے کیا کیا
مصحفِ پاک ہے، مذہب ہے خدا اسے کھیلے
زر پرستوں نے دکھائے ہیں تماشے کیا کیا

دُور ہے دُور بہت نقرئی کرنوں کا نظام　　　ظلمتوں میں ابھی آدم کو بھٹکنا ہو گا
اِن سمن پوش بہاروں سے لپٹنے کیلئے　　　کئی کانٹوں کو ابھی دل میں کھٹکنا ہو گا
آگ ہیں کتنے براہیموں کو پڑنا ہے ابھی
کتنے منصوروں کو سولی پہ لٹکنا ہو گا

○

احتجاج

یہ سوزِ عشق یہ زہرہ گداز تنہائی
رہِ وفا میں تیرا ساتھ کس نے چھوڑ دیا
نہ چوڑیوں کی کھنک ہے نہ پائلوں کی چھنک
تیری جوانی کے سازوں کو کس نے توڑ دیا
گداز باہوں میں انگڑائیوں کے افسانے
الم کے تند بگولوں میں ڈھلتے جاتے ہیں
تیری نگاہوں کی ضو آفرین کرنوں کو
حوادثِ غمِ دوراں نگلتے جاتے ہیں
شراب و شعر کا ماحول سوگوار ہے کیوں
گلوں کی راہ میں کانٹے بچھا دیئے کس نے
بہار آتے ہی گلشن کو کس نے لوٹ لیا
چراغ جلنے سے پہلے بجھا دیئے کس نے

یہ بکھرے بکھرے سے گیسو یہ سمٹی سمٹی نظر
نفس نفس میں یہ زہراب کس نے گھول دیا
ترے شباب کی انمول آرزوؤں کو
یہ سیم و زر کے ترازو میں کس نے تول دیا

نہ پھونک دیں کہیں دیر و حرم یہ انگارے
تری اداس نگاہوں نے جن کو پالا ہے
یہ احتجاج یہ خاموش احتجاج ترا
پکار بن کے فضاؤں کو ڈسنے والا ہے

سخن گسترانہ

(پدرم سلطان بود کا نعرہ لگانے والے ایک فلسفی نوجوان سے)

جواں نظر کو مبارک ہو ارتقائے حیات
عقیدتوں کا یہ اظہار، ارجمندی ہے
بجا ہے فخر اگر پستیاں بھی کرنے لگیں
یہی اگر ترے افکار کی بلندی ہے
تیرا ادب کی یہ تقسیم کا نیا نعرہ
قدامتوں کا نیا روپ لے کے آیا ہے
یہ وہ محل ہے کہ ذہنی نجاستوں کیلئے
شعور فرقہ پرستی نے جو بنایا ہے
خودی کی رمز حقیقی کو تو سمجھ نہ سکا
ضرورت اس کو ہے کچھ وقت نظر کی ابھی
یہ فلسفہ کہیں گمراہ کر نہ دے تجھ کو
خبر نہیں ہے تجھے عظمت بشر کی ابھی

تیرا خیال ہے کون و مکاں کی وسعت میں
جو پختہ کار عقائد میں ہو فرشتہ ہے
مگر تجھے یہ حقیقت ابھی نہیں معلوم
بلند اس سے بھی اِنسانیت کا رِشتہ ہے
میں کیسے مانوں کہ انساں کے واسطے مذہب
منافرت ہی کا پیغام لے کے آیا ہے
جہاں کی تشنگی جس نے بجھائی ہے آکر
وہ اپنے ساتھ ہی جام لے کے آیا ہے
جو تو نے چھیڑی ہے بے وقت کی یہ شہنائی
تو ہی بتا کہ یہ کیسے کوئی پسند کرے
زمانہ آج بہت دُور جا چکا ہے دوست
یہ تیرے واسطے اُلٹی زقند کیسے بھرے

○

قیدی

(علی سردار جعفری کی گرفتاری پر)

آج پھر تو ہوا محبوسِ قفس اے ساتھی
آج وہ طوقِ گراں پھر تجھے پہنایا گیا

تیری آواز میں جمہور کی دھڑکن پاکر
باغیانہ تیرے افکار کو ٹھہرایا گیا

پھر جکڑ کر اسی قانون کی زنجیروں میں
اسی مانوس کٹہرے میں تجھے لایا گیا

سامراجوں کے دماغوں نے بنا تھا جس کو
آج پھر سے اسی افسانے کو دہرایا گیا

مدتوں محفلِ اغیار میں جو گونجا ہے
اسی نغمے کو نئے ساز پہ پھر گایا گیا

لیکن اے دوست تعجب نہ ہو تجھ کو کہ ابھی
گورے آقاؤں کی تقلید زبوں باقی ہے

ہم نے گو سطوتِ اغیار کا توڑا ہے طلسم
ابھی سرمایہ پرستی کا فسوں باقی ہے

گرچہ آزار غلامی سے ملی ہم کو نجات
فرقہ وارانہ تعصب کا جنوں باقی ہے

کتنے آتشکدے گلزار بنائے ہم نے
پہ ابھی سوزشِ غم ہائے دروں باقی ہے

سعیٔ پیہم سے کئی دھبے مٹائے لیکن
دامنِ زیست پہ انسان کا خوں باقی ہے

دیکھ مشرق سے چمکتا ہوا سورج اُبھرا
اب کوئی دم میں یہ تاریکیاں چھٹ جائینگی

کوئی دن اور مقدر میں ہے زندان بلا
آمریت کی یہ زنجیریں بھی کٹ جائینگی

گُل ہوا اجنبی شاہوں کے شبستاں کا چراغ
کل یہ فرسودہ بساطیں بھی اُلٹ جائینگی

پھاند کر کتنے حصاروں کو چلے آتے ہیں
سونے چاندی کی یہ دیواریں بھی ہٹ جائینگی

جو ڈراتے ہیں قفس سے ہمیں کیا سادہ ہیں
آج ہم دار و رسن کے لئے آمادہ ہیں

○

ستارے قرنوں سے ایک انداز پر تبسم لٹا رہے ہیں
کبھی تو یہ بد مذاق قدسی پرانی اُنکی قبا اتاریں

بڑھے چلو ـــــــ!

منزل یہ کہاں ہے ابھی منزل ہے بہت دُور
رُکو نہیں بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ روکو
ہم اہلِ جنوں میں نہیں سستانے کا دستور

اے ہم نفسو! بجھنے نہ پائیں یہ شرارے
کیوں فکر ہے تم آج اکیلے تو نہیں ہو
سب دنیا کے مزدور ہیں ہمراہ تمہارے

یہ محل، یہ ایواں، یہ شبستانِ امارت
پجتے ہوئے قرنوں سے زر و سیم کے اصنام
دیکھو تو کوئی دم میں ہوئے جاتے ہیں غارت

وہ محو ہوا دورِ قدامت کا فسانہ
سرمایہ پرستی کا فسوں ٹوٹ رہا ہے
وہ عظمتِ جمہور کا آیا ہے زمانہ

ہر سمت نئے دور کا فرمان ہے جاری
ہو چین کہ جاپان کہ برما کہ ملایا
پھیلی ہے ہر اک گوشے میں تحریک ہماری

○

یقین و عمل

بجھے بجھے نظر آتے ہیں اب خرد کے چراغ
جنوں کی مشعلیں بیدار ہوتی جاتی ہیں
ہے اجلے ذہنوں کے قبضے میں عصرِ نو کی عناں
اتر رہے ہیں لحد میں شکست خوردہ دماغ

بسورتے ہوئے چہروں پہ خشم طاری ہے
فسردہ آنکھوں میں شعلے سے رقص کرتے ہیں
نیا نظام نئی عظمتوں کے ساتھ آیا
پرانی قدروں کے چہروں سے خون جا رہا ہے

افق افق کو نئی کروٹوں میں ڈھال دیا
کرن کرن نے نشیبوں میں روشنی بھر دی
سمٹ گئے ہیں دھندلکے نکھر گئی ہے فضا
نئی شعاعوں نے ماحول کو اجال دیا

مگر جہاں کو براہیم کی تلاش نہیں
اگرچہ آج بھی آتشکدے دہکتے ہیں
ہر ایک بازو ہے اب آشنائے ضربِ کلیم
کہ آج آدمی ٹھٹھری ہوئی سی لاش نہیں

فتادگی سے جنونِ خرام پست نہیں

یہ کامیابی کی تمہید ہے شکست نہیں

تیری نظر کی یہ تقسیم ہے یقین بھی کر

ازل سے دہر میں کوئی بلند و پست نہیں

وہ خاک سمجھیں گے تعریفِ ارتقائے حیات

جواب بھی سوچ رہے ہیں کہ بود و ہست نہیں

جہاں کو چشمِ تعمق سے دیکھنے والے

ہزار حیف کہ تو آئینہ بدست نہیں

بغاوتوں سے عبارت ہے عظمتِ انساں

وفا شعار تو میں ہوں وفا پرست نہیں

حوادثِ غمِ دوراں کا کیا گلہ فارغؔ

یہ شکر ہے میرا ذوقِ نگاہ پست نہیں

قدیم و جدید

وہ رہ گذر کہ دھندلکوں میں جس نے دم توڑا
کبھی بقا کا حسیں راز بن کے ابھرا تھا
نگاہیں وقفِ تجسّس ہیں لیکن اب تو وہاں
مٹا سا بھی کوئی نقشِ قدم نہیں ملتا
وہ دل کہ وسعتِ کون و مکاں کے حامل تھے
فریب خوردۂ افسونِ رنگ و بو ہی رہے
جنوں کو وہمِ وفا تھا وفا کو وہمِ جنوں

حیات آج طلسمات میں اسیر نہیں
قدیم راہ گذاروں کے سونے مرقد پر
ہوئی ہے ایک نئی شاہراہ کی تعمیر
قدم قدم پہ ستاروں کی شمعیں روشن ہیں
نظر نظر میں بسا ہے شعورِ منزل کا
خلوص ہو تو کوئی اب بھٹک نہیں سکتا

دولتِ مشترکہ

اٹھو قدیم رفیقو ذرا سنبھل جاؤ — یہ بپھری موجیں کہیں بیکراں نہ ہو جائیں
دلوں کی دھڑکنیں بیدار ہوتی جاتی ہیں — جنوں نواز امنگیں جواں نہ ہو جائیں

جو دل کہ موت کے آغوش میں تھے خوابیدہ — وہ جاگ اُٹھے ہیں پیامِ زندگی لیکر
وہ حرّیت کے پرستار بڑھتے آتے ہیں — جواں نظر میں بغاوت کی روشنی لیکر

نحیف و زار ارادوں میں ہے توانائی — خموش و گنگ زبانیں بھی آج گویا ہیں
وہ قافلے کہ جو مانوس تھے نشیبوں سے — ہر اک قدم پہ نئی رفعتوں کے جویا ہیں

جو رُک سکا نہ یہ طوفاں تو پھر ہمارے لئے — نہ سروری نہ حکومت نہ تاج شاہی ہے
نہ سن سکیں گے زر و سیم کی یہ جھنکاریں — ہر ایک گام پہ اِک مستقل تباہی ہے

اٹھو اٹھو کہ لگا دیں پھر انتشار کی آگ — حقیقتوں کی تجلّی کے کارخانے میں

یہ سرخ سُرخ دھندلکے نکھر گئے تو ہمیں
پناہ مل نہ سکے گی کہیں زمانے میں

اجالا

آج بازو میرے بڑھتے ہیں لپکنے کیلئے   دل کو احساس سا ہوتا ہے توانائی کا

سامنے منزلِ مقصود نظر آتی ہے

زندگی خواب نہیں اب کسی سودائی کا

سرنگوں اب نظر آتا ہے اندھیروں کا غرور   ظلمتِ شب میں ابھر آیا سحر کا تارا

آج پابندیٔ ساحل سے ہیں موجیں آزاد

اب افق تک نظر آتا ہے جنوں کا دھارا

میرے احساس کے پردوں میں کوئی بانگِ درا   جانے کس سمت سے آئی ہے کہ سن سکتا ہوں

اوس کے یاسمیں قطرے کہ جو کل آنسو تھے

آج وہ روپ لیے ہیں کہ میں چن سکتا ہوں

رقص کرتی ہوئی آتی ہیں سنہری کرنیں   پڑتے جاتے ہیں گھنی تیرہ گھٹاؤں میں شگاف

زندگی نور کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے

دور ہوتے لگے تاریک عقیدوں کے غلاف

یوں زمانے کے خیالات نے کروٹ بدلی
کہ روایات کی دھندلی سی خلائیں بھی نہیں
چند ماضی کی صدائیں ہیں تعاقب میں ہنوز
اِس قدر دھیمی صدائیں کہ صدائیں بھی نہیں
ایسی کتنی ہی صدائیں ہوں تعاقب میں مگر
برق پا وقت کا رہوار نہیں رُک سکتا
کوئی زنجیر بھی ذہنوں کو نہیں کس سکتی
اب کسی در پہ بھی انسان نہیں جھک سکتا

○

سحر سے پہلے

یہ سرمئی سے ہیولے افق کے دامن پر
ہر ایک لحظہ نئی ہیئتیں بدلتے ہوئے
کبھی دلوں کی حسیں دھڑکنوں کا روپ لیے
کبھی خیال کی پرچھائیوں میں ڈھلتے ہوئے
کبھی نگاہ کو حسن فریب دیتے ہوئے
کبھی جنوں کی اڑانوں کے ساتھ چلتے ہوئے
کبھی حکایت عہدِ طرب سناتے ہوئے
غمِ حیات کا لاوا کبھی اگلتے ہوئے

یہ سرمئی سے ہیولے افق کے دامن پر
تصوّرات کا عنوان بنتے جاتے ہیں
جو داستاں کہ ابھی وقت بننے والا ہے
زبانِ حال سے وہ داستاں سناتے ہیں
جو دب چکی ہیں حوادث کی شاہراہوں میں
ان اونگھتی ہوئی یادوں کو گدگداتے ہیں

میں سوچتا ہوں مگر سوچتا ہی رہتا ہوں
ہر ایک موڑ پہ یہ آئینہ دکھاتے ہیں

خزاں کا گرچہ تسلط ہے صحن گلشن پر　　میری نگاہوں میں رعنائی بہار بھی ہے
خمار گریہ شب ہی نہیں مآلِ حیات　　اسے سحر کے تبسم کا انتظار بھی ہے
مدام بیکس و مجبور ہی نہیں انساں　　کبھی کبھی اسے قسمت پہ اختیار بھی ہے

میں سوچتا ہوں کہ یہ تلخ زندگی میری
ہو تیرا ساتھ میسر تو خوشگوار بھی ہے

مگر نہیں نئی زنجیر میں نہ پہنوں گا　　ابھی تو مجھ کو پرانا قفس جلانا ہے
ابھی تو توڑنا ہے مجکو یہ فسردہ نظام　　ابھی تو مجکو نئی بستیاں بسانا ہے
ابھی تو نوع بشر کے عروج کی خاطر　　مجھے فضاؤں کی وسعت کا بھید پانا ہے

ابھی تو کرنا ہے خود مجکو اسکا استقبال
نئی حیات کا جو قافلہ روانہ ہے

خوش حال خان خٹک

(پشتو زبان کا لافانی حریت پرست فنکار)

آدمیت خونچکاں انسانیت تاراج تھی
ارض مشرق روشنی کے واسطے محتاج تھی
ایشیا کی سرزمیں مدت سے تھی ظلمت نصیب
اے کہستانی ادیب

اوج پر رہتا تھا ظل اللہیوں کا اقتدار
جا بجا بکھرے تھے ہر طرف اندھی عقیدت کے شکار
بن چکی تھی ادعائے ہوش کی دنیا رقیب
اے کہستانی ادیب

ہو رہا تھا ظلم مذہب کے مقدس نام پر
ٹوٹتے تھے پے بہ پے کوہِ ستم ہر گام پر
نشۂ ثروت میں کھوئے تھے اخوت کے خطیب
اے کہستانی ادیب

چھا رہا تھا ہر طرف جمہور کش فاشی نظام
بیکس و مظلوم اِنسانوں کا جینا تھا حرام
زندگانی تھی زمانے میں ہلاکت کے قریب
اے کہستانی ادیب

تُو نے توڑا اونچی اونچی بارگاہوں کا غرور
خاک میں تُو نے ملایا کجکلاہوں کا غرور
ہند میں آزادیٔ جمہور کے پہلے نقیب
اے کہستانی ادیب

تیری جانبازی حریفانِ وغا میں فرد تھی
تیرے آگے سطوتِ اورنگ شاہی گرد تھی
جاگ اُٹھے تیرے بل بوتے پہ خوابیدہ غریب
اے کہستانی ادیب

رشک کرتا ہے جہاں اب بھی ترے کردار پر
اِک قلم پہ ہاتھ تھا اور دوسرا تلوار پر
تو کبھی سرکش مجاہد تھا کبھی باغی ادیب
اے کہستانی ادیب

یادگاریں

(انگریز سامراج کے عہد میں قصہ خوانی بازار پشاور میں ۲۳ر اپریل ۱۹۳۰ء کا ایک خونیں حادثہ)

یہ سرزمیں

یہ حریّت پناہ سرزمیں

یہ حریّت پناہ سرزمیں کہ جس کے شیردل جواں
وطن کی حریّت کے واسطے قضا سے لڑ گئے
جو لٹ گئے جو مر گئے جو کٹ گئے
مگر جو ایک بار آگے بڑھ گئے تو ڈٹ گئے

یہ تربتیں

یہ سُرخ تربتیں

ان انقلابیوں کی یادگار ہیں
کہ جن کا خون قصہ خوانی کی زمیں پہ بہہ گیا
جو سینہ تان کر کھڑے رہے

برستی گولیوں کے سامنے
وہ جن کے سر نہ سامراج کے حضور جھک سکے
گنوں کے خوف سے کبھی قدم نہ جن کے رُک سکے
وہ جن کی ہمتوں کو بھاری بیڑیاں نہ کس سکیں
وہ جن کے عزم آہنی کو ڈہشتیں نہ ڈس سکیں
وہ جن کی موت
اپنی حریت کی داستان کا
اک سنہری باب ہے!

○

سا تھیو بڑھتے چلو کام ابھی باقی ہے

اپنے صیاد کا اک دام ابھی باقی ہے

ابھی تھک کے نہ بیٹھو اے میرے ہمسفرو

یہ تو آغاز تھا انجام ابھی باقی ہے

میکدے والو خدارا ابھی اُلٹو نہ بساط

شورشِ گردشِ ایام ابھی باقی ہے

سننے والو ذرا کانوں کے دریچے کھولو

وقت کا آخری پیغام ابھی باقی ہے

قصۂ دار و رسن ختم نہ ہونے پائے

دیکھنا داغؔ بدنام ابھی باقی ہے

مرا غم جاوداں ہونے لگا ہے
زمانہ ہم زباں ہونے لگا ہے

یہ منزل کون سی ہے کارواں بھی
غبارِ کارواں ہونے لگا ہے

خوشا یہ حسن سعیٔ رازداری
کہ عالم رازداں ہونے لگا ہے

حریفِ کار ہوگا کون جز قیس
وفا کا امتحاں ہونے لگا ہے

جنونِ شوق کا انجام معلوم
غمِ سود و زیاں ہونے لگا ہے

سرسری سی بھی سرِ راہ ملاقات نہیں
آخر اس درجہ بھی مجبوریٔ حالات نہیں

اے مجھے مژدۂ انوار سُنانے والو
گر یہی دن ہے تو دُنیا میں کہیں رات نہیں

کہتے ایسا بھی کوئی ہے کہ جو معتوب نہ ہو
میں گنہگار سہی خیر کوئی بات نہیں

میں تو بیگانۂ اربابِ وفا ہوں اے دوست
تجھ کو احساس گرانبارئ حالات نہیں

امتیازات تو ہیں دیر و حرم تک محدود
اس قدر تنگ نظر اہلِ خرابات نہیں

بازیٔ عشق کا آئین عجب ہے داغ
مات ہو جائے بھی اس میں تو کوئی بات نہیں

ارتقا

دہر میں انقلاب آتے رہے — بزمِ عالم کا نقشہ بدلتا رہا
ہر نیا دَور لایا نئی وسعتیں — جن میں اِنساں کا ذہن ڈھلتا رہا
اِن روایات کو پھاند کر آدمی — نت نئی شاہراہوں پہ چلتا رہا

اور ہمیشہ سے تہذیبِ نو کا چراغ
آندھیوں کے تھپیڑوں میں جلتا رہا

کارواں کاروانوں سے ٹکرا گئے — کہنہ افکار کو نیند سی آ گئی
جب اُفق پر گھٹاؤں نے قبضہ کیا — کوئی اُجلی کرن نُور برسا گئی
تیرگی کا مقدر بدلنے لگا — روشنی سی فضاؤں میں لہرا گئی

ٹمٹماتے ستارے اگر بُجھ گئے
ناچتی مسکراتی سحر آ گئی

دیویاں وقت کی ہر نئے دَور میں — کچھ نئی داستانیں سنانے لگیں
عہدِ ماضی کی دم توڑتی قوتیں — عہدِ حاضر کو آنکھیں دکھانے لگیں

برق نے پھونک ڈالے نشیمن اگر محنتیں بلبلوں کی ٹھکانے لگیں
پھول مرجھا گئے تو نئی کونپلیں
گلستانوں کی رونق بڑھانے لگیں

مشعلیں ارتقا کی لئے زندگی ظلمتوں کا فسوں توڑتی ہی رہی
پستیوں میں نشیبوں میں بڑھتی رہی رفعتوں سے نظر جوڑتی ہی رہی
ڈھونڈتی ہی رہی یہ نئی منزلیں ملگجے راستے چھوڑتی ہی رہی
روکنے کو چٹانیں جو حائل ہوئیں
ان چٹانوں کا منہ موڑتی ہی رہی

آج ان مشعلوں کی حرارت سے ہی ساری دنیا کے سینے میں ہیجان ہے
سارے عالم کو ہے زندگی کی طلب ساری دھرتی کو جینے کا ارمان ہے
اس تجسّس کے فیضِ کرامات سے آج نوعِ بشر کو یہ عرفان ہے
ایک ذرہ قیامت درآغوش ہے
ایک قطرہ حقیقت میں طوفان ہے

○

رحمان بابا

(پشتو کے عظیم فنکار رحمان بابا کے یوم پیدائش پر)

خیبر کی سنگین چٹانوں کے دامن میں سونے والے
پتھریلی راہوں میں علم و فن کے موتی بونے والے
تلواروں کی جھنکاروں میں تو نے عشق کے نغمے گائے
اندھی راتوں کے سینے میں الفت کے فانوس جلائے
نوکِ خنجر پر پلنے والوں کو پریم کے راز بتائے
سرکش لہروں کو دریا میں رہنے کے آداب سکھائے
خون کے زہریلے دھارے میں تو نے آکر امرت گھولا
پیار بھرے گیتوں کی لے کے روپ میں ہر اک دل کو ٹٹولا
تُو نے غزل کو وسعت دے کر ایک نیا گلزار کھلایا
پشتو ادب کے بوسیدہ دامن کو لالہ زار بنایا
اے پختونوں کو آزادی کے انداز سکھانے والے
قفس کے پردے میں حریت کا فانوس جلانے والے

دیکھ کہ اب پھر تیرے وطن کو جابر قوت لوٹ رہی ہے
دیکھ کہ تیرے کھلیانوں پر ظلم کی بجلی ٹوٹ رہی ہے
تیرے نقشِ قدم پر چلنے والا اب کوئی بھی نہیں ہے
تیری شمع وفا پہ جلنے والا اب کوئی بھی نہیں ہے
کل کے مانند آج بھی خوشیاں اونچے محلوں میں پلتی ہیں
خانوں کے حجروں میں ہمارے خون کی قندیلیں جلتی ہیں
غربت کا سینہ چھلنی کرتے ہیں سیم و زر کے پجاری
نقّاروں کے شور میں گم ہو جاتی ہے طوطی کی زاری
کل بھی اپنی اجڑی تقدیروں کا باعث تھی یہ شاہی
آج بھی اس کے فیض سے ہی آتے ہیں نظر آثار تباہی

○

جس دیوانے نے جس عہد میں بھی حق کا اظہار کیا ہے
باطل کی اندھی طاقت نے اس کو وقف دار کیا ہے

اے مجھ پر انساں کی محبت کا الزام لگانے والو
اس محبوب گنہ سے آخر میں نے کب انکار کیا ہے

دیکھ فقیہہ شہر مجھے مذہب سے کوئی بَیر نہیں ہے
سچ پوچھے تو تیری غلط تاویلوں نے بیزار کیا ہے

ایسے جانبدار خدا کی میرے دل میں کیا عظمت ہو
جس نے مجھے مجبور بنایا اور تجھے مختار کیا ہے

آج وہ گلشن میں سستا ہے آج وہ پھولوں کو ڈستا ہے
جس نے اپنے خون سے اس ویرانے کو گلزار کیا ہے

اے نمرودِ عصرِ حاضر میں ایسا مجرم ہوں جس نے
اپنے جرم کا موت کے شعلوں کی زد میں اقرار کیا ہے

یومِ مئی

مزدوروں اور محنت کش انسانوں کا تہوار ہے یہ
فسطائیت کی گردن پر سب سے پہلا وار ہے یہ
برسوں پہلے مشرق میں خونی پرچم لہرایا تھا
جس نے پسماندہ طبقے کا سرد لہو گرمایا تھا
ظلمت کا بُت خانہ جس کی ضرب سے چکنا چور ہُوا
اندھے ماضی کا سینہ رعنائی سے معمور ہُوا
ہر اک سال کے کیلنڈر پر یہ تاریخ جب آتی ہے
آج تلک اس دن کی مقدس یاد منائی جاتی ہے
دُنیا کا گوشہ گوشہ طُوفانوں میں ڈھل جاتا ہے
خُونی پرچم کا افسانہ ہر مفلس دہراتا ہے
وقت کا ہاتھ اُلٹنے لگتا ہے جب فرسودہ سن کو
یہ پرچم ہر سال بڑھا دیتا ہے اپنے دامن کو
اس تاریخ میں آخر اک دن ایسا بھی آجائے گا
بڑھتے بڑھتے جب یہ ساری دھرتی پر چھا جائے گا

ناظمِ حکمت

(ترکی کے پرولتاری شاعر کے نام جو عرصۂ دراز تک حریتِ افکار کی بنا پر قید بند کے مصائب جھیلتا رہا)

مردِ بیمار کے دانا و توانا فرزند
غم نہ کر باپ نے گر عاق کیا ہے تجھ کو
دشمنوں نے تجھے زنداں میں چھپایا لیکن
وقت نے شہرۂ آفاق کیا ہے تجھ کو

شب کی ہول آفریں ظلمت میں ترے خامے نے
ندرتِ فکر کا فانوس جلانا چاہا
آمریت کی وبا پھیل رہی تھی جس وقت
قوم کو تُو نے تباہی سے بچانا چاہا

تُو اسی جرم میں محبوسِ قفس ہے اب تک
تیری آواز پہ پہرے ہیں قلم پر پہرے
اور یہ پہرے کوئی تجھ تک ہی نہیں ہیں محدود
اسجگہ بھی ہیں "خداوندوں" کے ہم پر پہرے

لیکن ان پہروں کی شدت کو بڑھا دینے سے
نور و نکہت کا یہ سیلاب نہ رُک پائے گا
ابھی بیدار تو ہو لینے دے انساں کا شعور
سارا عالم ترے افسانے کو دُہرائے گا

حال تاریک گپھاؤں میں تجھے لایا ہے
ایک مستقبلِ رخشاں ترا سرمایہ ہے

طلسم ظلمتِ شب تار تار ہوتا ہے
نمود جلوۂ صبح بہار ہوتا ہے

قدم قدم پہ سہی گیر و دار ہم کو مگر
حریفِ گردش لیل و نہار ہوتا ہے

یہ دیکھ لینا پہنچنا ہے ہم کو منزل تک
تمہیں غبار سرِ رہگذار ہوتا ہے

حقیر جان کے جس کا اڑا رہے ہو مذاق
یہ جام وہ ہے جسے زر نگار ہوتا ہے

جو گونجتی ہیں زر و سیم کی یہ جھنکاریں
انہیں بھی نالۂ بے اختیار ہوتا ہے

اٹھو زمانے کی قدریں بدلنے والی ہیں
غریب شہر کو اب شہریار ہوتا ہے

قطعات

چاندنی رات اور تنہائی
کس قدر تلخ ہے مرا احساس
کس نے خاموش ساز چھیڑ دیا
سارا ماحول ہے اداس اداس

○

آج پھر چیخ رہا ہے ڈھولک
کسی دوشیزہ کی شادی ہوگی
اقربا کے ستم بے جا پر ——
چشم تسلیم جھکا دی ہوگی

○

تیرے ہونٹوں میں گیت پلتے ہیں
تیری آنکھوں سے صبح پھوٹتی ہے
سانس رکتا ہے گردشوں کا جب
تیری انگڑائی بن کے ٹوٹتی ہے

○

آج مرجھا رہے ہیں لب تیرے
گیسوؤں میں وہ آب و تاب نہیں
وقت کی ہولناک راہوں میں
کھو گیا ہے تیرا شباب کہیں

○

عالمِ عیش میں کبھی یوں ہی
روح میں کپکپی سی ہوتی ہے
جس طرح غم نصیب دوشیزہ
گھر میں آنکھیں بچا کے روتی ہے

○

یہ ترے لب شراب آلودہ
رس ٹپکتا ہے میٹھی باتوں سے
گیسوؤں میں نکھر رہا ہے حُسن
دن چراغاں بنا ہے راتوں سے

○

تو میرے بس میں آج ہے پھر بھی
ایک گونہ وہی ہے پیاس مجھے
لب تیرے مسکرا رہے ہیں مگر
نظر آتے ہیں کیوں اداس مجھے

○

تیری آواز کتنی پیاری ہے
عارضی ہو کہیں نہ یہ بھی سکوں
اسی دھوکے میں عمر کٹ جائے
کاش میں تجھ کو دیکھ ہی نہ سکوں

○

بھول کر اپنی شانِ محبوبی
یوں بہک اُٹھے بادہ نوشی میں
جس طرح کوئی نغمہ پھوٹ پڑے
رات کی پُر سکوں خموشی میں

○

دیکھ کر ان کا التفاتِ ناز
ایسی سرعت سے نبض چلتی ہے
جس طرح کوئی ڈوبتی کشتی
بچ کے ساحل پہ آ نکلتی ہے

○

روشنی لوٹ کر ستاروں کی
کون مستانہ وار آتی ہے
یہ تبسم کی جنّتیں لیکر —
کس کی قسمت جگانے جاتی ہے

○

اے ستاروں کو توڑنے والی
جھوٹے موتی میں کیا بھلائی ہے
سارے عالم کو روندنے والی
مجھ سے کیوں پیار کرنے آئی ہے

○

خار و گل گلستاں کی ہیں اولاد
یہ بگڑتے ہیں وہ سُلجھتے ہیں
پھر بھی کتنے دماغ سوچ میں ہیں
کانٹے پھُولوں سے کیوں اُلجھتے ہیں

○

چاند کا رقص تیری آنکھوں میں
کس قدر عیش فزا ہوتا ہے
تو جو ہنستی ہے تو اے صبحِ حیات
شامِ فرقت کا خدا روتا ہے

○

اِس میں بھی ہے اگر خوشی تیری
دُور ہی تجھ سے رہ کے جی لوں گا
زندگانی مجھے عزیز سہی ——
تیرے ہاتھوں سے زہر پی لوں گا

○

دیکھ کر آپ کی جوانی کو
آرزوئے شراب ہوتی ہے
روز توبہ کو توڑتا ہوں میں
روز نیت خراب ہوتی ہے

دونوں سے انجمن کی رونق ہے
پھول ہنستا ہے شمع روتی ہے
دونوں یکساں جگمگاتے ہیں —
ایک آنسو ہے ایک موتی ہے

غنچے مہکے ہیں سبزہ لہکا ہے
بھیس بدلا ہے لالہ زاروں نے
باغ کے سرد سرد گوشوں میں
گرمیاں پھونک دیں بہاروں نے

کتنی تعبیریں پوری ہوتی ہیں
ایسے خوابوں کا اعتبار نہ کر
اونچے محلوں سے مجھ کو نفرت ہے
خلد کا ذکر بار بار نہ کر

○

اے وفا ناشناس رہنے دے
عہدِ الفت کو استوار نہ کر —
اب بہت دُور جا چکا ہوں میں
میرے آنے کا انتظار نہ کر

○

وہ دن ڈوبا ہوا خورشید رخصت
اُفق پر یُوں اندھیرا چھا رہا ہے
کہ جیسے معصیت کا کیف رنگیں
خیالِ زُہد کو بہکا رہا ہے

○

خمارِ شب جو ٹوٹا تو سحر کو
وہ یوں انگڑائی لے کر مسکرائے
بھٹکتے ہوں تہہ دریا میں جیسے
شفق کی احمریں موجوں کے سائے

○

عشق کیسا؟ یہاں یہ دولتِ حُسن
خوشہ چینوں میں عام بٹتی ہے
یہ سرائے ہے جس میں زر کے عوض
ہر مسافر کی رات کٹتی ہے

○

یہ لکیروں کا حسیں جال بُنا ہے کس نے
جن کے احساس سے ایمان لچک جاتے ہیں
مرمریں پھُول سے جسموں کی یہ تقسیم جمیل
دیکھ کر ان کو ملائک بھی بھٹک جاتے ہیں

○

غم کے کانٹوں پہ ہے سکوں مجھ کو
عیش کے پھول لوں تو کیا ہو گا
دردِ فرقت سے شاد کام ہوں میں
وصل میں جھول لوں تو کیا ہو گا

○

چمپئی باہوں سے تسکین تو ہوتی ہے مگر —
نبضِ احساس میں پھانس سی کھٹک جاتی ہیں
نقرئی قہقہے محفل کو جو گرماتے ہیں —
سرد چیخیں میرے سینے میں اٹک جاتی ہیں

○

مانا کہ چمکتے ہیں ڈھلکتے ہوئے آنسو
اشکوں کا جہاں اور ہے تاروں کا جہاں اور
کیوں نرگسی آنکھوں کو مسلتے ہو ابھی سے
اٹھے گا سلگتے ہوئے سینوں سے دھواں اور

○

مظلوم کی چیخوں کا گلا گھونٹ رہی ہے
منحوس ہے انساں کیلئے سکوں کی جھنکار
مزدور کو رہنے کا ٹھکانہ نہیں ملتا
یہ چاندی کی گلیاں ہیں تو وہ سونے کے بازار

○

پھیلاتے ہیں ہر سمت فضاؤں میں تعفّن
ہر لحظہ سماعت کو یہ ڈستے ہوئے نالے
بڑھتا ہوا آتا ہے وہ طوفان قیامت
ہے کوئی جو انساں کو تباہی سے بچالے

○